۵۲

الطّور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سے تعلّق

یہ سورہ اس گروپ کی تیسری سورہ ہے۔ پچھلی دونوں سورتوں —— قٓ اور الذّٰریٰت —— میں زندگی بعد موت، حشر و نشر اور جزاء و سزا کے عقلی و انفسی اور آفاقی و تاریخی دلائل بیان ہوئے ہیں اور اندازِ بیان عمومیت یعنی جزا اور سزا دونوں کے پہلو لیے ہوئے ہے چنانچہ الذّٰریٰت میں عمود کی حیثیت، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے، اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ (بے شک جس چیز کی تم کو دھمکی دی جا رہی ہے وہ سچی ہے اور جزاء و سزا واقع ہو کے رہے گی) کو حاصل ہے اور اس کی وضاحت کرتے ہوئے ہم لکھ چکے ہیں کہ یہ جزاء و سزا کے دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے، خواہ اس کا تعلق رحمت سے ہو یا عذاب سے۔ اس سورہ میں عذاب کے پہلو کو زیادہ نمایاں فرمایا ہے چنانچہ چند تاریخی اور آفاقی شواہد کا حوالہ دینے کے بعد قریش کو نہایت واضح الفاظ میں دھمکی دی ہے کہ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ (۷-۸) (بے شک تیرے رب کا عذاب واقع ہو کے رہے گا اور کوئی بھی اس کو دفع کرنے والا نہ بن سکے گا) یہی دھمکی اس سورہ میں مقسم علیہ کی حیثیت بھی رکھتی ہے اور یہی اس سورہ کا عمود بھی ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ اپنے مطالب کے اعتبار سے تین حصّوں میں تقسیم ہے۔

(۱-۱۶) یہ حصہ تمہیدی ہے۔ پہلے بعض اہم تاریخی و آفاقی حقائق کو شہادت میں پیش کر کے قریش کے متمردین کو دھمکی دی گئی ہے کہ جس عذاب سے تم کو ڈرایا جا رہا ہے اس کے لیے جلدی نہ مچاؤ، اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی تو وہ پیش آ کے رہے گا اور کوئی بھی اس کو ٹالنے والا نہ بن سکے گا۔ اس کے بعد چند آیتوں میں اس عذاب کے دن کی تصویر کھینچی گئی ہے اور تکذیب کرنے والوں کا اس دن جو حشر ہوگا بالاجمال اس کا بیان ہے۔

(۱۷-۲۸) مکذبین کے بالمقابل متّقین پر اللہ تعالیٰ اس دن جو فضل و انعام فرمائے گا اس کا بیان۔ اس انعام کا خاص پہلو جو یہاں نمایاں فرمایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کے جو بندے آل و اولاد کی دنیا بنانے سے زیادہ ان کی عاقبت سنوارنے کی کوشش کریں گے اللہ تعالیٰ ان کی باایمان اولاد کو جنت میں ان کے ساتھ جمع کر دے گا، اگرچہ اولاد اپنے اعمال کے اعتبار سے ان کے درجہ کی مستحق نہ ہو۔ اس یکجائی کے لیے اونچے درجے کے متّقین کے درجہ کو

نیچا نہیں کیا جائے گا بلکہ نیچے درجے والوں کا مرتبہ اونچا کر دیا جائے گا۔ اصل نتائج کا انحصار تو آدمی کے اعمال ہی پر ہوگا، اس وجہ سے نہ کسی کے عمل میں کوئی کمی ہوگی اور نہ کوئی ایمان سے محروم شخص جنت میں جا سکے گا لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل کا دروازہ اس کے باایمان بندوں کے لیے کھلا رہے گا۔

(۲۹ - ۴۹) خاتمۂ سورہ جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تمھاری تکذیب کے لیے کفار جو بہانے بنا رہے ہیں ان کی پروا کیے بغیر اپنا فرض تذکیر ادا کیے جاؤ تاکہ جن کو راہِ راست پر آنا ہو وہ راہ راست پر آجائیں اور جو اپنی گمراہی پر اڑے رہنا چاہیں ان پر حجّت تمام ہو جائے۔

اوپر آیت ۱۲ میں مخالفین کی جن سخن سازیوں اور تہمت تراشیوں کی طرف اشارہ ہے ان کی تفصیل اور ان کے مسکت جواب۔

متمرّدین کو تنبیہ کہ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب ان کی ساری چالیں بے کار ہو جائیں گی اور آخرت کے عذاب سے پہلے وہ اس دنیا میں بھی عذاب سے دوچار ہوں گے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و استقامت کی تلقین کہ اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو اور اطمینان رکھو کہ تم ہر وقت ہماری حفاظت میں ہو۔

صبر و استقامت کے حصول کے لیے نماز بالخصوص شب اور سحر کی نمازوں کے اہتمام کی تاکید۔

سُوْرَةُ الطُّوْرِ (۵۲)

مَكِّيَّةٌ —— اٰيات : ۴۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱ - ۲۸

وَالطُّوْرِ ۙ﴿۱﴾ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۙ﴿۲﴾ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۙ﴿۳﴾ وَّالْبَيْتِ
الْمَعْمُوْرِ ۙ﴿۴﴾ وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ۙ﴿۵﴾ وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ۙ﴿۶﴾ اِنَّ
عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۙ﴿۷﴾ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۙ﴿۸﴾ يَّوْمَ تَمُوْرُ
السَّمَآءُ مَوْرًا ۙ﴿۹﴾ وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ؕ﴿۱۰﴾ فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ
لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۙ﴿۱۱﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ ﴿۱۲﴾ يَوْمَ يُدَعُّوْنَ
اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ؕ﴿۱۳﴾ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا
تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۱۵﴾ اِصْلَوْهَا
فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا
كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ ۙ﴿۱۷﴾ فٰكِهِيْنَ
بِمَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ ۚ وَوَقٰهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿۱۸﴾
كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۙ﴿۱۹﴾ مُتَّكِـِٕيْنَ
عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴿۲۰﴾ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ

أَلَتْنٰهُم مِّنْ عَمَلِهِم مِّن شَيْءٍ ۚ كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ ﴿٢١﴾ وَ
أَمْدَدْنٰهُم بِفَاكِهَةٍ وَّلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ ﴿٢٢﴾ يَتَنَازَعُونَ فِيهَا
كَأْسًا لَّا لَغْوٌ فِيهَا وَلَا تَأْثِيمٌ ﴿٢٣﴾ وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ
كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُونٌ ﴿٢٤﴾ وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ﴿٢٥﴾
قَالُوا إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ ﴿٢٦﴾ فَمَنَّ اللّٰهُ
عَلَيْنَا وَوَقٰنَا عَذَابَ السَّمُومِ ﴿٢٧﴾ إِنَّا كُنَّا مِن قَبْلُ نَدْعُوهُ ۖ
إِنَّهُ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيمُ ﴿٢٨﴾ ع ۲۸ / ۲

ترجمۂ آیات ۱-۲۸

شاہد ہے طور اور کتاب لکھی ہوئی، جھلّی کے کھلے ہوئے اوراق میں۔ اور شاہد
ہے آباد گھر اور بلند چھت اور لبریز سمندر کہ تیرے رب کا عذاب واقع ہو کر رہے گا،
کوئی اس کو ٹالنے والا نہیں بن سکے گا۔ ۱-۸

اس دن کو یاد رکھو جس دن آسمان ڈانواں ڈول ہو جائے گا اور پہاڑ چلنے لگ
جائیں گے، پس بدبختی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی! اُن کی جو سخن گستری میں لگے
ہوئے کھیل رہے ہیں۔ جس دن کہ وہ آتشِ دوزخ کی طرف دھکے دے دے کر
لے جائے جائیں گے کہ یہ ہے وہ دوزخ جس کو تم جھٹلاتے رہے تھے۔ کیا یہ جادو
ہے یا تمھیں سجھائی نہیں دے رہا ہے! اس میں داخل ہو جاؤ، اب صبر کرو یا نہ کرو۔
تمھارے لیے یکساں ہے۔ تم وہی بدلے میں پا رہے ہو جو کرتے رہے تھے۔ ۹-۱۶

بے شک متّقی بندے باغوں اور نعمتوں میں ہوں گے۔ وہ محظوظ ہو رہے ہوں گے
ان نعمتوں سے جو ان کے رب نے ان کو دے رکھی ہوں گی اور اس بات سے کہ

ان کے رب نے ان کو دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھا۔ کھاؤ اور پیو بے غل و غش اپنے ان اعمال کے صلے میں جو تم کرتے رہے تھے۔ ٹیک لگائے ہوئے ہوں گے صف بہ صف، تختوں کے اوپر اور ہم ان کو بیاہ دیں گے غزال چشم حوریں۔ ۱۷-۲۰

اور جو لوگ ایمان لائے، اور ان کی اولاد نے بھی ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کی ان کے ساتھ ہم ان کی اولاد کو بھی جمع کر دیں گے اور ان کے عمل میں سے ذرا بھی کمی نہیں کریں گے۔ ہر ایک اس کمائی کے بدلے میں گرو ہو گا جو اس نے کی ہو گی۔ اور ہم ان کی پسند کے میوے اور گوشت ان کو برابر دیتے رہیں گے۔ ان کے درمیان ایسی شراب کے پیالوں کے تبادلے ہو رہے ہوں گے جو لغویت اور گناہ سے پاک ہو گی اور محفوظ موتیوں کے مانند چھوکرے ان کی خدمت میں سرگرم ہوں گے۔ ۲۱-۲۴

وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوں گے، دریافتِ حال کرتے ہوئے۔ کہیں گے، ہم اس سے پہلے اپنے اہل و عیال کے باب میں بڑے ہی چوکنّے رہے ہیں تو اللہ نے ہم پر اپنا فضل فرمایا اور ہمیں عذابِ دوزخ سے محفوظ رکھا۔ ہم اس سے پہلے اسی کو پکارتے رہے تھے، بے شک وہ بڑا ہی باوفا اور مہربان ہے۔ ۲۵-۲۸

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالطُّوْرِ (۱)

قسم اور مقسم علیہ

'وَ'، یہاں قسم کے لیے ہے اور یہ وضاحت اس کے محل میں تفصیل سے ہو چکی ہے[۱] کہ قرآن میں جو قسمیں کھائی گئی ہیں بیشتر اس دعوے کی شہادت کے لیے کھائی گئی ہیں جو اس قسم کے بعد بطور مقسم علیہ مذکور ہوا ہے۔ یہاں مقسم علیہ، جیسا کہ ہم نے تمہید میں اشارہ کیا، 'اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ' (بے شک تیرے رب کا عذاب

---

[۱] ملاحظہ ہو اقسام القرآن مؤلفہ امام حمید الدین فراہیؒ

واقع ہو کے رہے گا ہے۔ اس وجہ سے طُور کی قسم لازماً اس دعوے پر شہادت کے لیے کھائی گئی ہے۔ چنانچہ قسم کے اسی مفہوم کو پیشِ نظر رکھ کر ہم نے اس کا ترجمہ 'شاہد ہے طُور' کیا ہے اور یہ ترجمہ ہمارے نزدیک زیادہ معنی خیز ہے۔

'طُور' سے مراد وہی جبلِ طُور ہے جس کا ذکر مختلف پہلوؤں سے قرآن مجید میں بار بار ہوا ہے۔ اسی طُور کی ایک مقدس وادی 'طویٰ' میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مدین سے واپس ہوتے ہوئے، پہلی بار خدا کی تجلّی کا مشاہدہ ہوا۔ یہیں وہ شرف رسالت سے مشرّف ہوئے اور حکم ہوا کہ وہ فرعون اور اس کی قوم کے پاس منذر بن کر جائیں اور اس کو آگاہ کر دیں کہ اگر وہ اپنی سرکشی سے باز نہ آیا تو اپنی قوم سمیت اللہ کے عذاب کی زد میں آجائے گا۔ پھر فرعون کی ہلاکت کے بعد اسی طُور پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات دینے کے لیے بلایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیبت کے دوران میں جب بنی اسرائیل گوسالہ پرستی کے فتنہ میں مبتلا ہوئے تو اسی طُور کے دامن میں اپنی قوم کے سرداروں کو لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام اجتماعی توبہ کے لیے حاضر ہوئے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے سارے طُور کو ہلا دیا اور بنی اسرائیل کو متنبہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب —— تورات —— دے کر تم سے جو عہد لے رہا ہے، اگر اس عہد پر تم استوار نہ رہے تو یاد رکھو کہ اس کی قدرت یہ بھی ہے کہ اسی پہاڑ سے تمھیں کچل کے رکھ دے گا۔

اپنی ان گوناگوں خصوصیات کے سبب سے جبلِ طُور اس دعوے کی صداقت و شہادت کا ایک عظیم تاریخی نشان ہے جو اس قسم کے بعد مذکور ہوا ہے۔ چنانچہ اسی خصوص کی بنا پر اس کی قسم سُورۂ تین میں بھی کھائی گئی ہے اور وہاں بھی، جیسا کہ سورۂ تین کی تفسیر میں ان شاء اللہ ہم واضح کریں گے، اسی جزاء و سزا ہی کے پہلو سے اس کی قسم کھائی گئی ہے۔

ایک غلط فہمی بعض لوگوں نے لفظ 'طُور' کو یہاں عام پہاڑ کے معنی میں لیا ہے۔ لیکن یہ قول مختلف وجوہ سے کمزور ہے۔ اول تو قرآن کی تاویل معروف معنی کے لحاظ سے کرنی چاہیے۔ لفظ 'طُور' عبرانی یا سریانی میں پہاڑ کے معنی میں ممکن ہے آتا ہو لیکن عربی میں یہ اس معنی میں معروف نہیں۔ قرآن میں یہ لفظ بار بار آیا ہے اور ہر جگہ عَلم ہی کی حیثیت سے آیا ہے۔ دوسرے یہ کہ پہاڑ کے معنی لینے کی صورت میں مقسم علیہ کے ساتھ اس کی مطابقت باقی نہیں رہتی درآنحالیکہ یہ چیز ضروری ہے ورنہ قسم بے محل ہو جائے گی۔

وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ (۲)

'کتاب مسطور' سے مراد تورات ہے 'وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ' سے مراد یہاں تورات ہے۔ اس کا ایک واضح قرینہ تو یہ ہے کہ اس کا عطف 'طُور' پر ہے اور یہ کتاب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طُور ہی پر عطا فرمائی۔ دوسرا قرینہ یہ ہے کہ اس کی صفت 'فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ' آئی ہے۔ 'رَقّ' باریک کھال کو کہتے ہیں جو زمانہ قدیم میں لکھنے کے مصرف میں آتی تھی اور تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تورات شروع شروع میں صاف کی ہوئی باریک کھالوں

بھی پر لکھی جاتی جو طومار کی شکل میں لپیٹ کر رکھی جاتیں اور تلاوت کے وقت ان کو پھیلا لیا جاتا - ان قرائن کی موجودگی میں تورات کے سوا کسی اور کتاب کو مراد لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے اس سے دفترِ اعمال کو مراد لیا ہے، لیکن یہ اس کا محل نہیں ہے۔ اس کی شہادت اس دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں مؤثر ہو سکتی ہے۔

مُقسم علیہ کے ساتھ بھی اس کا تعلق بالکل واضح ہے۔ جس طرح 'طُور' اللہ تعالیٰ کے قانونِ مجازات کا ایک تاریخی نشان ہے اسی طرح تورات بھی ایک عظیم تحریری ریکارڈ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا قانونِ مجازات بھی نوشتہ ہے اور اس قانون کے تحت اس نے دنیا میں قوموں کے ساتھ جو معاملات کیے ہیں ان کی تاریخ بھی محفوظ ہے۔ اس تاریخ کو پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ مکافاتِ عمل کا قانون حضرت آدمؑ کے وقت سے برابر جاری ہے اور اس کا یہ تسلسل اس امر کی دلیل ہے کہ یہ برابر جاری رہے گا، یہاں تک کہ ایک ایسا دن بھی آئے گا جس میں اللہ تعالیٰ کے عدلِ کامل کا ظہور ہوگا۔ اس دن جس نے ذرّہ برابر بھی برائی کی ہوگی وہ اس برائی کی سزا بھگتے گا اور جس نے رائی کے برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ اس کا صلہ پائے گا۔

لفظ 'کِتَاب' کی تنکیر اس کی شان کے اظہار کے لیے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن سے پہلے یہی کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے خلق کی ہدایت اور آخرت کے عذاب سے ڈرانے کے لیے اتاری اور جس کے بنیادی احکام تحریری شکل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عنایت فرمائے۔ اس سے پہلے حضرات انبیاء علیہم السلام نے جو تعلیم دی وہ تمام تر زبانی دی۔ ان کی تعلیمات کو تحریری شکل میں لانے کا آغاز اسی کتاب سے ہوا اس وجہ سے اس کا ذکر خاص اہمیت کے ساتھ ہوا۔ اس تعلیم بالقلم سے خلق پر اتمامِ حجت کے جو پہلو ظہور میں آئے ان پر ان شاء اللہ سورۂ رحمٰن اور سورۂ علق کی تفسیر میں ہم روشنی ڈالیں گے۔

فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (۳)

ایک کھلا صحیفہ

لفظ 'رَقّ' کی تحقیق اوپر بیان ہو چکی ہے۔ اس کتاب کے پھیلے ہوئے اوراق میں ہونے کا حوالہ یہاں خلق پر اتمامِ حجت کے پہلو سے ہے۔ یعنی یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے بلکہ ایک آشکارا حقیقت ہے جو بالکل کھلے اور پھیلے ہوئے اوراق میں بیان ہوئی ہے۔ جو شخص چاہے، اس کو پڑھ سکتا ہے اور اگر پڑھ نہیں سکتا تو اس کو پڑھوا کر سن سکتا ہے۔ بلکہ اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس کتاب کے حاملین سے مطالبہ کرے کہ وہ اس کو بتائیں اور سنائیں کہ اس کتاب میں اللہ تعالیٰ نے کیا بیان فرمایا ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اہلِ عرب دینی معاملات میں اہلِ کتاب کی برتری تسلیم کرتے رہے ہیں، چنانچہ جگہ جگہ قرآن نے ان کو توجہ دلائی ہے کہ اگر وہ نہیں جانتے تو اہلِ کتاب سے پوچھ لیں۔ پھر یہ

بات بھی ہے کہ تورات میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی تاریخ بھی بیان ہوئی ہے اور اہلِ عرب اس بات کے مدعی تھے کہ وہ جس دین پر ہیں وہ ان کو اپنے انہی اجداد سے وراثت میں ملا ہے، گویا ان کے لیے یہ ایک لطیف اشارہ ہے کہ وہ اس کتاب سے معلوم کر سکتے ہیں کہ ان کے اجداد نے ان کو جزاؤ سزا سے ڈرایا ہے یا نہیں۔

وقت کے یہود پر ایک لطیف تعریض

لفظ 'منشور' میں وقت کے یہود پر نہایت لطیف تعریض بھی ہے۔ قرآن میں یہ بات جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ یہود اپنے صحیفوں کی بہت سی باتیں چھپاتے ہیں۔ کتمانِ حق کی یہ بیماری یہود کے اندر ان کے دورِ زوال میں پیدا ہوئی اور اس کے پیدا ہونے کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ لوگ ان پیشین گوئیوں سے واقف ہوں جو تورات کے صحیفوں میں نبی آخرالزمان (صلی اللہ علیہ وسلم) سے متعلق وارد ہیں اور جن میں ان کو یہ دھمکی بھی دی گئی ہے کہ اگر انھوں نے اس نبی کی تکذیب کی تو وہ خدا کے مغضوب اور امامت سے محروم ہو جائیں گے۔ اس لفظ سے یہود کو تورات کی اصل نوعیت کی یاددہانی فرمائی گئی کہ یہ پھیلے ہوئے، صاف و شفاف اوراق میں تھی کہ لوگ اس کو پڑھیں اور سمجھیں اور اس کے اوراق ہر وقت لوگوں کے سامنے کھلے رہیں، لیکن وہ اپنی بدبختی سے ان کو چھپاتے ہیں۔ یہی حقیقت حضرت مسیحؑ نے یہود کو خطاب کر کے یوں واضح فرمائی ہے کہ 'تم کو چراغ دیا گیا تھا کہ گھر میں اس کو بلند جگہ پر رکھو کہ سارے گھر میں روشنی پھیلے، لیکن تم نے اس کو پیمانے کے نیچے ڈھانک کر رکھا ہے'۔

وَالْبَیْتِ الْمَعْمُوْرِ (۴)

'بیتِ معمور' سے مراد

'بیتِ مَعْمُور' سے عام طور پر مفسرین نے جنت کے اندر ایک گھر کو مراد لیا ہے جو فرشتوں کے لیے آسمان میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو زمین میں انسانوں کے لیے بیت اللہ الحرام کی ہے۔ لیکن یہ قول، ہمارے نزدیک، یہاں غیر متعلق ہے۔ اس طرح کا کوئی گھر جنت میں ہے تو اس کی شہادت اس دعوے کے حق میں کیا وزن رکھتی ہے جو اس قسم کے بعد پیش کیا گیا ہے؟ ہمارے مفسرین کو چونکہ یہ غلط فہمی ہے کہ قسم جس چیز کی کھائی جائے وہ کوئی مقدس چیز ہونی چاہیے، اس وجہ سے وہ صرف مقسم بہ کے تقدس کو دیکھتے ہیں حالانکہ اصل دیکھنے کی چیز مقسم بہ کا تقدس نہیں بلکہ پیش کردہ دعوے پر اس کی شہادت کا پہلو ہے۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو دعوے کے ساتھ اس کا کوئی تعلق سمجھ میں نہیں آتا۔

بعض لوگوں نے اس سے بیت اللہ کو مراد لیا ہے۔ یہ قول اس پہلو سے تو وزن دار ہے کہ 'بلدِ امین' کی قسم سورۂ تین میں جزا اور سزا کے حق ہونے پر کھائی گئی ہے۔ بیت اللہ چونکہ اسی بلدِ امین میں واقع ہے اس وجہ سے اس کی شہادت بھی اپنے اندر ایک معنویت رکھتی ہے لیکن سیاق و سباق اس قول کے خلاف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے بعد 'سقف مرفوع' کی قسم کھائی گئی ہے اور 'سقفِ مرفوع' سے بیت اللہ کی چھت ظاہر ہے کہ مراد نہیں ہو سکتی۔ اس سے آسمان ہی مراد ہو سکتا ہے

اور مفسرین نے آسمان ہی کو مراد لیا بھی ہے۔ اگر اس سے آسمان ہی مراد ہے تو بیت اللہ کی قسم کے کے بعد آسمان کی قسم اور اس کے بعد دریا کی قسم یہ کچھ بے جوڑ سی قسمیں ہو جاتی ہیں۔ ان کے اندر وہ ہم رنگی و ہم آہنگی باقی نہیں رہتی جو طُور اور کتاب مسطور والی قسم میں پائی جاتی ہے۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ بیتِ معمور سے مراد یہ زمین ہے جس پر آسمان کی چھت پھیلی ہوئی ہے۔ اس خیال کی تائید میں کئی باتیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً

ایک یہ کہ زمین کے لیے بیت کا استعارہ نہایت موزوں ہے۔ قرآن نے جگہ جگہ اس کو 'مہاد' اور 'قرار' وغیرہ الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ نیز زمین کو فرش اور آسمان کو اس کی چھت سے مثال دے کہ اس کے گھر ہونے کو نہایت خوبصورت طریقہ پر ممثّل بھی کر دیا ہے۔

دوسری یہ کہ اس کے بعد آسمان کا ذکر اس بات کا نہایت واضح قرینہ ہے کہ اس سے زمین ہی مراد لی جائے۔ قرآن میں جہاں جہاں اللہ تعالیٰ کی عظیم نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے زمین اور آسمان دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ ہوا ہے۔

تیسری یہ کہ قرآن میں جگہ جگہ اس حقیقت کی وضاحت فرمائی گئی ہے کہ زمین میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی پرورش کے لیے جو گوناگوں اسباب و وسائل مہیّا فرمائے ہیں وہ اس بات کی نہایت واضح دلیل ہیں کہ انسان اس دنیا میں شترِ بے مہار نہیں ہے بلکہ وہ اپنے رب کے آگے جواب دہ ہے۔ لفظ 'معمور' یہاں زمین کے انہی اسباب و وسائل اور اس کے لازمی نتیجہ یعنی مسئولیت اور جواب دہی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

چوتھی یہ کہ سابق سورہ —— الذّٰریٰت —— میں فرمایا ہے کہ وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ (۲۰) (اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے) نیز فرمایا ہے کہ وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ (۲۲) (اور آسمان میں تمھارا رزق بھی ہے اور وہ چیز بھی جس سے تم کو ڈرایا جا رہا ہے) ان آیتوں کی تفسیر کرتے ہوئے ہم زمین و آسمان کی ان نشانیوں کی طرف اشارہ کر چکے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے قانونِ مجازات اور اس کے عذاب پر گواہ ہیں۔ بعینہٖ اسی چیز پر زمین و آسمان کی گواہی یہاں بھی پیش کی گئی ہے، صرف اسلوبِ بیان کا فرق ہے۔

ان مختلف وجوہ سے ہمارے نزدیک اس سے مراد زمین ہے اور لفظ 'معمور' سے اس کا موصوف ہونا خدا کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کی ان نشانوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے جس سے قرآن نے جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کے عدل اور جزا و سزا پر استدلال فرمایا ہے اور جس کی وضاحت اس کتاب میں ہم برابر کرتے آ رہے ہیں۔

وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوعِ (۵)

آسمان کی شہادت

زمین کے بعد یہ آسمان کی شہادت پیش کی گئی ہے۔ قرآن نے اپنے دعاوی کی تائید میں بالعموم زمین کی نشانیوں کے ساتھ آسمان کی نشانیوں کا بھی حوالہ دیا ہے۔ سورۂ ذاریات کی آیت وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ (۲۲) (اور آسمان میں تمھاری روزی بھی ہے اور وہ چیز بھی جس سے تم کو ڈرایا جا رہا ہے) نیز اس میں وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْحُبُكِ (۷) (دھاریوں والے آسمان کی قسم بھی ہے۔ اس کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ معتوب قوموں کی تباہی میں آسمان اور ابر و ہوا کے تصرفات کو کتنا دخل رہا ہے۔

آسمان کا ذکر قرآن میں موقع و محل کی رعایت سے مختلف صفات کے ساتھ ہوا ہے۔ یہاں اس کو 'سقف مرفوع' سے تعبیر فرمایا ہے۔ لفظ 'سقف' اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، عنایت اور رحمت پر دلیل ہے کہ یہ محض اس کی کرم گستری کا کرشمہ ہے کہ اس نے یہ عظیم شامیانہ ہمارے سروں پر تان رکھا ہے اور لفظ 'مرفوع' اس کی قدرت، عظمت اور کبریائی کو ظاہر کر رہا ہے کہ جو ذات اس عظیم اور ناپیدا کنار چھت کے بلند کر دینے پر قادر ہے کون سا کام ہے جو اس کے دائرۂ قدرت سے باہر ہو سکتا ہے! اللہ تعالیٰ کی صفات کے یہ دونوں پہلو (یعنی اس کی عنایت اور قدرت) جن مختلف اعتبارات سے آخرت اور جزا و سزا پر دلیل ہیں ان کی تفصیل اس کتاب میں ہم برابر کرتے آ رہے ہیں۔

وَالْبَحْرِ الْمَسْجُورِ (۶)

'مسجور' کے معنی بھرنے کے ہیں۔ 'سجر الرجل التنور' تنور کو ایندھن سے بھر دیا۔ 'سجر الماء النهر' پانی نے نہر کو لبریز کر دیا۔

سمندر کی شہادت

زمین اور آسمان کی شہادت کے بعد یہ زمین کی ایک سب سے بڑی نشانی سمندر کی قسم کھائی۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی زمین اور آسمان کی نشانیوں کا حوالہ دینے کے بعد سمندر کی نشانیوں کا ذکر آیا ہے، ملاحظہ ہوں سورۂ رحمٰن کی آیات ۱۰-۲۴۔ ان آیات پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ زمین و آسمان کی نشانیوں میں سے سمندر اپنے اندر خدا کی توحید، اس کی قدرت، اس کی ربوبیت اور اس کی جزاء و سزا کے اتنے شواہد رکھتا ہے کہ انسان ان کو شمار نہیں کر سکتا۔ ان شواہد کی تفصیل اس کتاب میں جگہ جگہ ہم کرتے آ رہے ہیں۔ ان بحثوں کو ان کے محل میں دیکھیے۔ بعض اہم امور سورۂ رحمٰن کی تفسیر میں بھی ان شاء اللہ زیر بحث آئیں گے۔ یہاں سورہ کے عمود اور مقسم علیہ کے تعلق سے اتنی بات یاد رکھیے کہ ان قسموں کے بعد جس عذاب سے ڈرایا گیا ہے اس کی تاریخی شہادت قوم نوح کے واقعہ میں بھی موجود ہے اور قوم فرعون کے واقعہ میں بھی۔ یہ دونوں قومیں سمندر ہی کے عذاب میں گرفتار ہوئیں جس کی تفصیلات تورات میں بھی موجود ہیں اور قرآن میں بھی۔

إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝ مَّا لَهُ مِن دَافِعٍ (۷-۸)

اصل دعویٰ جو سورہ کا عمود ہے

یہ ہے وہ اصل دعویٰ جو اوپر کی قسموں کے بعد پیش کیا گیا ہے اور یہی اس سورہ کا عمود بھی ہے۔ یہی بات معمولی تغیرِ الفاظ کے ساتھ، سابق سورہ میں ہواؤں کی قسم کے بعد یوں ارشاد ہوئی ہے: اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ (الذّٰریٰت: ۵-۶) (بے شک جس چیز سے تمھیں ڈرایا جا رہا ہے وہ سچی ہے اور بے شک جزا اور سزا ہو کے رہے گی) بس اتنا فرق ہے کہ اس میں عذاب کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ ہم سابق سورہ میں اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ کی شرح کرتے ہوئے اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سے مراد درحقیقت وہ عذاب ہے جس سے اللہ کے رسولوں نے دنیا اور آخرت میں ڈرایا ہے۔ اس سورہ میں گویا وہی بات واضح فرما دی گئی ہے جو سابق سورہ میں مضمر تھی۔ اجمال کے بعد تفصیل اور اضمار کے بعد توضیح قرآن مجید کا معروف اسلوب ہے جس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

اوپر قسموں کی وضاحت کرتے ہوئے ہم ان شواہد کی طرف اشارہ کر چکے ہیں جو اس دعوے پر دلیل ہیں۔ ان کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ انہی کا حوالہ دے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم قریش کو جس عذاب سے ڈرا رہے ہو اور جس کا وہ مذاق اڑا رہے ہیں وہ واقع ہو کے رہے گا، کوئی اس کو دفع کرنے والا نہ بن سکے گا۔ یعنی نہ تو ان کی اپنی قوت و جمعیت اس کے مقابل میں کچھ کام آئے گی اور نہ ان کے معبودِ شرکاء و شفعاء ان کو اس سے چھڑا سکیں گے۔ نہ دنیا میں اس سے کوئی بچا سکے گا اور نہ آخرت میں کوئی سہارا دے سکے گا۔ طُور پر موسیٰ (علیہ السلام) کو جو خبر دی گئی، تورات کے صحیفوں میں جو ریکارڈ موجود ہے، یہ زمین جن آثار و شواہد سے معمور ہے، یہ سقفِ نیلگوں جن عجائبِ تصرفاتِ قدرت کی گواہی دے رہی ہے اور یہ سمندر جن آیاتِ الٰہی کے امین ہیں ان کو دیکھو اور ان پر غور کرو، وہ اس وعید کی تصدیق کے لیے کافی ہیں۔ ان کے علاوہ کسی اور نشانی کی ضرورت نہیں ہے۔ ان نشانیوں سے جن لوگوں کی آنکھیں نہیں کھلیں گی وہ اگر آسمان کا کوئی ٹکڑا اپنے اوپر گرتا ہوا بھی دیکھیں گے تو اس کو بھی عذاب کے بجائے ابرِ باراں سمجھ کر خوشی سے ناچیں گے، یہاں تک کہ وہ ان کو تباہ کر کے رکھ دے گا لیکن وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

يَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ۝ وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ۝ فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ (۹-۱۲)

یوم عذاب کی تصویر

یہ اس عذاب کی تصویر ہے کہ اس دنیا میں یہ آسمان جو نہایت ہی محکم اور اپنے مقام پر ٹکا ہوا نظر آتا ہے ڈانواں ڈول ہو جائے گا۔ 'مَوْر' کے معنی مضطرب اور متردّد ہو کر ادھر ادھر حرکت کرنے کے ہیں۔ یعنی اس کا کوئی ٹکڑا کسی سمت کو جاتا ہوا نظر آئے گا، کوئی کسی جانب کو، اسی طرح یہ پہاڑ جو اپنی جگہ گڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اکھڑ کر بالکل بگٹٹ چلنے لگیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دن جب آسمان اور پہاڑوں کا یہ حال ہوگا تو انسانوں پر کیا گزرے گی! اس دن کسی کی قوت و جمعیت

اور کسی کے قلعے اور مورچے کیا کام آنے والے بن سکیں گے! یہاں یہ بات یاد رکھیے کہ جب قریش کے سرکشوں کو قیامت کے دن کسی ہلچل کی خبر دی جاتی تو وہ بانداز استہزاء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرتے کہ اس دن ان پہاڑوں کا کیا بنے گا، کیا یہ بھی ٹوٹ پھوٹ جائیں گے! قرآن نے دوسرے مقام میں انہی لوگوں کے جواب میں فرمایا ہے کہ ان لوگوں کو بتا دو کہ میرا رب ان کو بھی ریزہ ریزہ کر دے گا۔

'فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ' فرمایا کہ اس دن ان لوگوں کے لیے ہلاکی ہی ہلاکی ہے جو اس کو آج جھٹلا رہے ہیں۔ 'الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ' یہ انہی جھٹلانے والوں کی صفت ہے جس سے کلام بالکل مطابق حال ہو گیا ہے اور یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آگئی کہ اس سے مراد وہی متمردین قریش ہیں جو مختلف قسم کی سخن سازیوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے اور آپ کے انذار کو ہوا میں اڑا دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان سخن سازیوں کی تفصیل اسی سورہ میں آگے آیات ۲۹-۴۶ میں آئے گی۔

مخالفین کی خاک بازی

'خوض' کے معنی کسی چیز کے اندر گھسنے کے ہیں۔ 'خَاضَ الماءَ' وہ پانی کے اندر گھس گیا۔ اسی سے 'خاض القوم فی الحدیث' کا محاورہ نکلا جس کا مفہوم یہ ہے کہ لوگ بات سے بات پیدا کرتے ہوئے کہیں سے کہیں جا نکلے۔ عام طور پر یہ محاورہ کسی باطل کی حمایت اور حق کی مخالفت میں سخن سازی اور دلیل بازی کے لیے آتا ہے۔ قرآن میں یہ اسی معنی میں جگہ جگہ آیا ہے۔ مثلاً 'وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا' (التوبۃ: ۶۹) (اور تم نے بھی اسی طرح کی دلیل بازیاں کیں جس طرح کی دلیل بازیاں انھوں نے کیں)؛ 'فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ' (الزخرف: ۸۳) (پس ان کو چھوڑو وہ دلیل بازیاں اور سخن سازیاں کرتے رہیں، یہاں تک کہ وہ اپنے اس دن سے دوچار ہوں جس کی ان کو دھمکی دی جا رہی ہے)۔

کسی بات کو حق سمجھتے ہوئے اس کی مخالفت میں دلیلیں گھڑنے کی کوشش کرنا اپنی اور اپنے پیرووں کی عقل کے ساتھ ایک قسم کی دل لگی ہے اس وجہ سے قرآن نے اس کو 'لعب' سے تعبیر فرمایا ہے۔ خاک بازی کا یہ کھیل یوں تو ہر حال میں نہایت خطرناک ہے لیکن اس صورت میں آخری حد تک خطرناک ہو جاتا ہے جب اس کے نتیجے میں ایک ابدی خسران سے سابقہ پیش آنے والا ہو۔

اس 'خوض' کی پوری تفصیل آگے آ رہی ہے۔ اس سے اشارہ مخالفین کی اس طرح کی باتوں کی طرف ہے جو وہ اپنے ضمیر کے خلاف محض اس لیے کہتے کہ کسی طرح اس اثر کو مٹائیں جو قرآن کی دعوت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام سے لوگوں کے دلوں پر پڑ رہا تھا۔ مثلاً یہ کہ کوئی آپ کو کاہن کہتا، کوئی شاعر، کوئی آپ کو مفتری قرار دیتا اور کوئی شیخی باز۔ اسی طرح بعض یہ دعویٰ بھی کرتے کہ جس طرح کا کلام یہ پیش کر رہے ہیں اس طرح کا کلام ہم بھی پیش کر سکتے ہیں۔ غرض آپ کو زچ کرنے کے لیے جس کو جو بات

بھی سوجھ پاتی وہ بے دھڑک کہہ گزرتا ۔ حق کی مخالفت میں یہ نکتہ آفرینیاں ان کے لیے محض دل لگی تھی ۔ یہ سوچنے کی توفیق کسی کو نہ ہوتی کہ اس دل لگی سے اپنے اور اپنی قوم کے لیے وہ ابدی جہنم کا سامان کر رہے ہیں ۔

يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ۗ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ (۱۳ - ۱۴)

آخرت کا مذاق اڑانے والوں کا انجام

اس دن ان دل لگی بازوں پر جو آفتیں نازل ہوں گی ، یہ ان کی تفصیل ہے ۔ 'دَعّ' کے معنی پوری شدت و نفرت کے ساتھ دھکا دینے کے ہیں اور اس کے بعد 'دَعًّا' اس کی مزید تاکید کے لیے ہے یعنی آج یہ دل لگی میں معروف ہیں لیکن اس دن یہ جہنم کی طرف دھکے دے دے کر ہانکے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ دوزخ جس کا دنیا میں تم مذاق اڑاتے اور جس کو جھٹلاتے تھے ۔

اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ (۱۵)

یعنی دنیا میں جب اللہ کا رسول تم کو اس سے ڈرا رہا تھا تو تم اپنے آپ کو اور اپنے عوام کو اس سے بےفکر رکھنے کے لیے قرآن کے انذار کو الفاظ کی جادوگری قرار دیتے تھے ۔ اب بتاؤ یہ الفاظ کی جادوگری ہے یا ایک حقیقت ہے لیکن جس طرح تم دنیا میں اس سے اندھے بنے رہے اسی طرح اب بھی تمھیں یہ دکھائی نہیں دے رہی ہے !

اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۶)

حکم ہو گا کہ جاؤ اس میں پڑو ۔ تمھارے لیے اب کوئی مفر نہیں ۔ خواہ صبر کرو یا رؤو چلاؤ ، دونوں تمھارے لیے یکساں ہے ۔ نہ صبر کی داد ملنی ہے اور نہ آہ و فریاد کی شنوائی ہونی ہے ۔ 'اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ' یہ جو کچھ تمھارے سامنے آیا ہے تمھارے اپنے ہی اعمال ہیں ۔ اگر تمھارے ساتھ کوئی ناانصافی ہوئی ہوتی اور تم فریاد کرتے تو شنوائی اور فریاد رسی کی توقع کر سکتے تھے لیکن جب تمھاری اپنی ہی کمائی تمھارے سامنے آرہی ہے تو فریاد کس کے خلاف کرو گے اور شنوائی کی توقع کس سے کرو گے !

'اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ' سے مراد یہ نہیں ہے کہ بعینہٖ وہ اعمال ان کے سامنے آئیں گے جو انھوں نے دنیا میں کیے ہوں گے بلکہ مراد ان اعمال کی حقیقتیں ہیں ۔ دنیا میں انسان جو عمل بھی کرتا ہے ، خواہ نیکی کا عمل ہو یا بدی کا ، وہ اپنے اثرات و نتائج کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک خاص شکل اختیار کرتا ہے اور اسی شکل میں وہ عمل کرنے والے کے سامنے آئے گا ۔ اگرچہ اس کی شکل اس سے مختلف ہو گی جس شکل میں وہ اس دنیا میں انجام پایا لیکن چونکہ وہ اسی کی بوئی ہوئی فصل کا حاصل ہو گا اس وجہ سے فرمایا کہ تم وہی بدلے میں پا رہے ہو جو تم دُنیا میں کر کے آئے ہو ۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ (۱۷)

متقین کا صلہ

'مکذبین' کے انجام کی سنگینی کو واضح تر کرنے کے لیے ان کے مقابل میں 'متقین' کا صلہ و انعام بھی بیان فرما دیا۔ تقابل کا اصول دلیل ہے کہ 'متقین' سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے پیغمبر کے انذار کا مذاق اڑانے کی جگہ اس کی باتیں گوشِ دل سے سنیں، ان پر غور کیا اور ان کو حرزِ جاں بنایا۔ فرمایا کہ یہ لوگ بے شک باغوں اور نعمتوں میں ہوں گے۔

فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۚ وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ (۱۸)

یہ ان باغوں اور نعمتوں سے ان کو بہرہ مند اور محظوظ ہونے کی تفصیل آ رہی ہے۔ فرمایا کہ ان کے رب نے ان کو جو کچھ بخش رکھا ہو گا اس سے وہ پوری آزادی کے ساتھ محظوظ ہو رہے ہوں گے۔ 'بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ' میں جو ابہام ہے وہ تفخیم شان پر دلیل ہے کہ آج کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ ان کا رب ان کو کیا کچھ بخش دے گا۔ ان کی حقیقت اس دن کھلے گی جس دن یہ عطا ہوں گی اور انھیں پر کھلیں گی جن کو عطا ہوں گی۔

'وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ' کا عطف میرے نزدیک 'بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ' پر ہے۔ یعنی وہ اپنے رب کی بخشی ہوئی بے پایاں نعمتوں سے محظوظ اور خاص طور پر اس کے اس فضل پر خوش ہو رہے ہوں گے کہ اس نے ان کو اپنی توفیق بخشی سے دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھا۔ لفظ 'فٰكِهِيْنَ' میں مسرت و ممنونیت کا مضمون خود مضمر ہے اس وجہ سے اس مفہوم کے لیے کوئی الگ لفظ لانے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ اس سے یہ بات نکلی کہ جس دوزخ کو اس کے مکذبین آج اپنے مذاق کا موضوع بنائے ہوئے ہیں اہل جنت قیامت کے دن اس سے نجات پانے کو اپنے رب کا سب سے بڑا فضل و احسان سمجھیں گے اور اس پر ان کا رواں رواں شکرگزار ہو رہا ہو گا۔ یہ مضمون آگے اسی سورہ میں یوں آیا ہے: 'قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ۝ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ' (۲۶-۲۷) (وہ کہیں گے ہم پہلے اپنے اہل و عیال میں بڑے چوکنے رہے ہیں تو اللہ نے ہم پر احسان فرمایا اور ہم کو عذاب سموم سے محفوظ رکھا)۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓــًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۹)

یعنی ان لوگوں کو رب کریم کی طرف سے بشارت دی جائے گی کہ اب اپنے اعمال کے صلے میں بے خل و غش کھاؤ پیو۔ نہ اس سے کوئی ضرر لاحق ہو گا، نہ اس میں کمی واقع ہو گی اور نہ اس کے لیے تمھیں دکھ جھیلنا پڑے گا۔

'هَنِيْٓء' فعیل کے وزن پر صفت ہے۔ اس کے معنی ہیں راس آنے والی چیز۔ یہاں یہ درحقیقت مصدر محذوف کی صفت واقع ہے۔ پورا جملہ یوں ہے: 'كُلُوْا وَاشْرَبُوْا اَكْلًا وَّ شُرْبًا هَنِيْٓــًٔا'۔ بعض لوگوں نے اس کو حال کے مفہوم میں لیا ہے لیکن یہ رائے عربیت کے خلاف ہے۔

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ (۲۰)

'مُتَّكِـِٕيْنَ' دراصل 'فٰكِهِيْنَ' کی وضاحت ہے اور بیچ کا جملہ 'كُلُوْا وَاشْرَبُوْا ... الاٰیۃ' بطور جملہ معترضہ آ گیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے رب کی نعمتوں سے محظوظ ہو رہے ہوں گے صف بہ صف تختوں پر بیٹھے ہوئے۔ صف بہ صف ہونا ان کی نشست گاہوں کے کمال درجہ آراستہ ہونے کی بھی تعبیر ہے اور اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ ان میں باہم کامل محبت اور بے تکلفی ہوگی اس وجہ سے رُو در رُو ہو کر بیٹھیں گے۔ بعض جگہ یہ مفہوم 'مُتَقٰبِلِیْنَ' کے لفظ سے بھی ادا کیا گیا ہے۔

'وَزَوَّجْنٰھُمْ بِحُوْرٍ عِیْنٍ'۔ انسان کا کوئی لطف و سرور بھی بیوی بچوں کے بغیر مکمل نہیں ہوتا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ جنت میں یہ نعمت بھی اہلِ ایمان کے لیے مہیا فرمائے گا۔ اس کی تعبیر کے لیے الفاظ وہ استعمال فرمائے ہیں جن سے ہم اس کا فی الجملہ تصور کر سکیں۔ رہی اس کی اصل حقیقت تو اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ یہ آخرت ہی میں واضح ہوگی۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْھُمْ ذُرِّیَّتُھُمْ بِاِیْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِھِمْ ذُرِّیَّتَھُمْ وَمَآ اَلَتْنٰھُمْ مِّنْ عَمَلِھِمْ مِّنْ شَیْءٍ ؕ کُلُّ امْرِیٍٔ بِمَا کَسَبَ رَھِیْنٌ (۲۱)

اہلِ ایمان کی مسرت کی تکمیل کے لیے ایک بشارت۔

جنت میں اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کی مسرت کی تکمیل کے لیے جو اہتمام فرمائے گا اسی سلسلہ میں یہ بشارت بھی دی گئی ہے کہ ان کی اولاد میں سے جس نے ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کی ہوگی اللہ تعالیٰ ان کو بھی ان کے ساتھ ملا دے گا اگرچہ وہ ایمان و عمل کے اعتبار سے ان کے درجے کے مستحق نہ ہوں۔ اس یکجائی کے لیے ضابطہ یہ بیان فرمایا کہ 'وَمَآ اَلَتْنٰھُمْ مِّنْ عَمَلِھِمْ مِّنْ شَیْءٍ' اولاد کے ایمان کے کسر کا جبر ان کے والدین کے عمل میں کمی کر کے نہیں کیا جائے گا۔ وہ اپنے اسی مرتبہ پر سرفراز رہیں گے جس کے وہ اپنے ایمان و عمل کے اعتبار سے مستحق قرار پائے ہوں گے بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضلِ خاص سے ان کی اولاد کے درجے کو اونچا کر دے گا۔

'وَاتَّبَعَتْھُمْ ذُرِّیَّتُھُمْ بِاِیْمَانٍ' میں لفظ ایمان کی قید سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ رعایت صرف اسی اولاد کے لیے خاص ہے جس نے ایمان کے ساتھ اپنے بزرگ کی اتباع کی ہو۔ اگر وہ ایمان سے محروم ہو تو اس رعایت کی مستحق نہیں ہوگی اگرچہ وہ ان کے اتباع کی کتنی ہی بلند آہنگی کے ساتھ مدعی ہو۔

لفظ 'ایمان' کی تنکیر سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اس کے مدارج ہیں۔ اگر اولاد کو ایمان کا وہ ادنیٰ درجہ بھی حاصل ہوا جو اس کو جنت کے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کا بھی مستحق ٹھہراتا ہے تو وہ اس رعایت کی مستحق قرار پائے گی۔

نجات سے متعلق اصل ضابطہ۔

'کُلُّ امْرِیٍٔ بِمَا کَسَبَ رَھِیْنٌ'۔ یہ نجات سے متعلق اللہ تعالیٰ نے اصل ضابطہ بیان فرما دیا ہے کہ ہر شخص اپنے عمل کے عوض گرو ہے۔ عمل ہی چھڑائے گا، عمل ہی ہلاک کرے گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ ایمان و عمل کے بغیر محض نیکوں سے ظاہری نسبت رکھنے کے سبب سے کوئی جنت میں ان کے پاس پہنچ جائے۔ اللہ تعالیٰ اپنا فضل انہی پر فرمائے گا جو اپنے ایمان و عمل سے اس کا استحقاق پیدا کریں گے۔ اس میں یہود اور

مشرکینِ عرب دونوں کو تنبیہ ہے کہ انھوں نے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے دین کو تو بالکل مسخ کر کے رکھ دیا لیکن محض ان سے نسبی وابستگی کے بل پر جنت کے اعلیٰ مقامات پانے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ

یہاں ممکن ہے کسی کے ذہن میں سوال پیدا ہو کہ جب نجات کے باب میں اصل ضابطہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے عمل کے عوض میں گرو ہے تو اولاد کا اپنے سے برتر درجے کے بزرگوں کی صف میں جا پہنچنا کس بنیاد پر ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے تعلق رکھنے والا ہے جو اس نے اپنے باایمان بندوں کے لیے خاص رکھا ہے۔ اس سے اس ضابطہ کی نفی نہیں ہوتی جو 'کُلُّ امْرِئٍ بِمَا کَسَبَ رَهِیْنٌ' کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ نجات تو بے شک کسی کو ایمان و عمل کے بغیر حاصل ہونے والی نہیں ہے لیکن اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ اللہ تعالیٰ اپنے باایمان بندوں کے مراتب و مدارج میں اپنے فضل سے اضافہ بھی نہیں فرمائے گا۔ ان دونوں چیزوں کے دائرے الگ الگ ہیں۔ ان میں باہدگر کوئی تناقض نہیں ہے۔

ایک اور استنباط

اس آیت سے یہ بات بھی مستنبط ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جس طرح والدین کی خوشی کی تکمیل کے لیے ان کی اولاد کو ان کے ساتھ جمع کر دے گا اگرچہ اولاد اپنے ایمان و عمل کے اعتبار سے ان کے مرتبہ کی سزاوار نہ ہو۔ اسی طرح بلند مرتبہ اولاد کی مسرت کی تکمیل کے لیے ان کے ساتھ ان کے باایمان والدین کو بھی جمع کر دے گا اگرچہ والدین اپنے ایمان و عمل کے لحاظ سے ان کے درجے کے حق دار نہ ہوں۔ اس استنباط کی دلیل یہ ہے کہ جو تعلقِ خاطر والدین اور ان کی اولاد کے درمیان پایا جاتا ہے وہی تعلقِ خاطر اس دوسری صورت میں بھی موجود ہے۔

اس بشارت کا موقع و محل

یہاں اس بشارت کا موقع و محل بھی قابلِ توجہ ہے۔ اگر کسی شخص کے اندر سچا ایمان ہے تو وہ اپنی اولاد سے متعلق سب سے زیادہ فکرمند اس بات کے لیے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو آخرت کے ہول اور جہنم کے عذاب سے محفوظ رکھے۔ یہ ارمان کہ اولاد کو دنیوی کامیابیاں حاصل ہوں اگر ہوتا بھی ہے تو اس کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔ چنانچہ حضراتِ انبیاء اور صالحین نے اپنی اولاد کے لیے جو دعائیں فرمائی ہیں ان میں آخرت کی کامیابی کو مقدم رکھا ہے بلکہ اسی چیز کو اصل کی حیثیت دی ہے۔ یہی حال ان لوگوں کا تھا جو اس دور میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ان کے قلوب جب نورِ ایمان سے منور ہوئے تو ان کو سب سے زیادہ تشویش اپنی اولاد کے دنیوی مستقبل سے متعلق نہیں بلکہ اس کے اخروی انجام سے متعلق ہوئی۔ ان کی اس تشویش کا اظہار آگے اسی سورہ کی آیت ۲۶ 'اِنَّا کُنَّا قَبْلُ فِیْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِیْنَ' (بے شک ہم اس سے پہلے اپنے اہل و عیال کے اندر چوکنے اور خبردار رہے ہیں) سے ہوتا ہے۔ اس آیت کے تحت ہم ان شاء اللہ واضح کریں گے کہ اس میں جس ڈر یا تشویش کا حوالہ ہے اس سے مراد ان کا یہ اندیشہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جس گلّے کا چرواہا بنایا ہے اس کی کوئی بھیڑ بھیڑیے کا لقمہ نہ بنے بلکہ

جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو جاہلیت کی تاریکی سے نکال کر صراط مستقیم کی ہدایت بخشی ہے اسی طرح ان کی اولاد کو بھی ایمان کی توفیق نصیب ہو تاکہ ان کو جہنم کے ہول سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے انہی باایمان بندوں کی تسلّی کے لیے یہ بشارت دی کہ اگرچہ یہ ضابطہ تو بالکل اٹل ہے کہ کسی شخص کو نجات ایمان و عمل کے بدون حاصل نہیں ہوگی لیکن اللہ تعالیٰ اپنے باایمان بندوں پر یہ فضل ضرور فرمائے گا کہ اگر ان کی اولاد نے ان کی پیروی کی تو، گو ایمان کے اعتبار سے اس کا درجہ فروتر ہو لیکن اللہ تعالیٰ اولاد کو ان کے ساتھ جمع کر دے گا اور اس یکجائی کے لیے ان کے درجے کو نیچا نہیں کرے گا بلکہ اولاد کے درجے کو اونچا کر دے گا۔

اولاد کی اصلاح کے لیے فکرمند رہنے کی تعلیم

یہ اس بات کی تعلیم ہے کہ ہر شخص اپنی اولاد اور اپنے متعلقین کو ایمان کی راہ دکھانے کی کوشش، جس حد تک اس کے امکان میں ہو، ضرور کرے۔ ایمان کے بغیر کسی شخص کو بھی نجات حاصل نہیں ہوگی اگرچہ وہ کسی نبی اور رسول کی اولاد ہی کیوں نہ ہو۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ کسی کی اولاد نے اگر ایمان کی راہ اختیار کر لی تو گو اس کا ایمان ادنیٰ درجے کا ہی ہو لیکن اس کو اپنے رفیع المنزلت بزرگوں کی معیت جنت میں ضرور حاصل ہو جائے گی۔

وَاَمۡدَدۡنٰهُمۡ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحۡمٍ مِّمَّا يَشۡتَهُوۡنَ (۲۲)

یعنی جس طرح ہم ان کی اولاد کو یکجا کر دیں گے اسی طرح ان کے لیے مطلوب فواکہ اور ان کے مرغوب گوشت میں بھی اضافہ کر دیں گے۔ لفظ 'اَمۡدَدۡنَا' اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ تعداد کے اضافے کے ساتھ ساتھ ان کے لیے رزق و فضل میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔

'فَاكِهَة' اور 'لَحۡم' کے دونوں لفظوں کے اندر تمام غذائی نعمتیں جمع ہو گئی ہیں، خواہ وہ تفکہات کی نوعیت کی ہوں یا غذا کی۔

يَتَنَازَعُوۡنَ فِيۡهَا كَاۡسًا لَّا لَغۡوٌ فِيۡهَا وَلَا تَاۡثِيۡمٌ (۲۳)

جنت کا لطف و سرور

یہ اس لطف و سرور کا بیان ہے جس سے وہ جنت میں بہرہ مند ہوں گے۔ فرمایا کہ ان کے درمیان جامِ شراب کے تبادلے ہو رہے ہوں گے۔ 'تَنَازَعُوا الْكَاۡسَ' کے معنی ہیں 'تعاطوها' یعنی وہ آپس میں ایک دوسرے کی طرف شراب کے جام بڑھائیں گے۔ چھین جھپٹ اس لفظ کے لوازم میں سے نہیں ہے۔ لفظ 'کَاۡسٌ' ظرف اور مظروف یعنی شراب اور جامِ شراب دونوں کے لیے آتا ہے۔

لَا لَغۡوٌ فِيۡهَا وَلَا تَاۡثِيۡمٌ۔ یعنی یہ شراب ان برے اثرات سے بالکل پاک ہوگی جو دنیا کی شراب کے لوازم میں سے ہے۔ اس شراب سے آدمی نہ تو کسی لغو گوئی میں مبتلا ہوگا اور نہ کسی پر گناہ کی تہمت لگائے گا۔ 'اثمه تاثیما' کے معنی ہیں اس نے اس کو گناہ کی تہمت لگائی۔ اس دنیا کی شراب کے مفاسد میں سے یہ بھی ہے کہ اس بدمستی میں آدمی اپنے حریفوں اور ان کی بہو، بیٹیوں پر ہر قسم کی تہمتیں جڑ دیتا ہے جس سے زمانۂ جاہلیت

میں بڑے بڑے خاندانی فتنے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ قرآن نے دوسرے مقام میں اسی فتنہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اس کے ذریعہ سے شیطان تمھارے درمیان عداوت اور بغض کی آگ بھڑکانا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس جنت کی شراب اہلِ جنت کے درمیان الفت و محبت کی عطر بیزی کرے گی، چنانچہ سورۂ واقعہ میں فرمایا ہے: لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَأْثِيْمًا ۙ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا (۲۵-۲۶) (اس میں کوئی لغو اور گناہ کی بات نہیں سنیں گے۔ صرف سلام اور جواب سلام کا چرچا ہو گا)

وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ (۲۴)

یعنی ان کی خدمت اور ان کی فرمائشوں کی تعمیل کے لیے ہر وقت ایسے چھوکرے ان کے سامنے حاضر رہیں گے جو اپنی پاکیزگی اور اپنے حسن و جمال کے اعتبار سے معلوم ہو گا کہ موتی ہیں جو صدف میں محفوظ رہے ہیں اور ان کی خدمت ہی کے لیے ان سے نکلے ہیں۔ اہلِ عرب کسی چیز کی غایت درجہ نفاست و نزاکت کی تعبیر کے لیے لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ کی تشبیہ استعمال کرتے ہیں۔ قرآن کے اندازِ بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان چھوکروں کو خاص اسی مقصد کے لیے پیدا کرے گا۔ بعض لوگوں کی رائے اس کے خلاف بھی ہے لیکن ان کے حق میں کوئی دلیل نہیں ہے اس وجہ سے اس پر تنقید کی ضرورت نہیں ہے۔

وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ (۲۵)

اہلِ جنت کا ایک دوسرے سے دریافتِ حال

جنت میں مجتمع ہو جانے کے بعد، جس طرح ایک دراز اور کٹھن سفر کے مسافر منزل پر پہنچ کر ایک دوسرے سے دریافتِ حال کرتے ہیں اسی طرح اہلِ جنت تڑپ کر ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوں گے اور پوچھیں گے کہ کہیے کیسے گزری، راہ میں کیسی گھاٹیوں سے گزرنا پڑا، منزل تک کس طرح پہنچنا ہوا اور یہ اہل و عیال کی یکجائی کیسے نصیب ہوئی۔

قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ (۲۶)

جواب دینے والے جواب دیں گے کہ ہم اس سے پہلے دنیا میں اپنے اہل و عیال کے اندر ڈرتے رہنے والے رہے ہیں۔ اپنی عاقبت کے ساتھ برابر ان کی عاقبت کی بھی ہمیں فکر رہی ہے۔ ہم اس غرور میں کبھی مبتلا نہیں ہوئے کہ ہمارا بڑا خاندان اور بڑا کنبہ و قبیلہ ہے اور اس دنیا میں ہمیں جو کچھ حاصل ہے یہ ہمارا پیدائشی اور خاندانی حق ہے، اس کو کوئی ہم سے چھین نہیں سکتا۔ ہم نے آخرت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا اور اپنے رب سے برابر یہ دعا کی کہ قیامت کے دن وہ ہمیں صالحین کے سربراہ کی حیثیت سے اٹھائے، فسّاق کے پیشوا کی حیثیت سے نہ اٹھائے۔ ہم نے اپنی اولاد کو ہمیشہ نماز، زکوٰۃ اور خدا سے ڈرتے رہنے کی تاکید اور دینِ حق پر جینے اور اسی پر مرنے کی وصیت کی۔

فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ (۲۷)

ہمارے اس خوف و اندیشہ کی برکت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان فرمایا کہ ہم کو اور ہماری اولاد کو اس

بہشت میں یکجا کر دیا اور آتشِ دوزخ کی ہوائے گرم سے اس نے ہمیں محفوظ رکھا۔ 'سموم' ہوا نے گرم اور آگ کی آنچ کو کہتے ہیں۔ یہ اسلوبِ بیان اللہ تعالیٰ کی غایت درجہ لطف و احسان کی تعبیر کے لیے وہ اختیار فرمائیں گے مطلب یہ کہ دوزخ اور آتشِ دوزخ تو درکنار اللہ تعالیٰ نے اس کی ہوائے گرم سے بھی ہمیں محفوظ رکھا۔

إِنَّا كُنَّا مِن قَبْلُ نَدْعُوهُ إِنَّهُ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيمُ (۲۸)

انسان کی نجات میں اصل عامل کی حیثیت عقیدۂ توحید کی ہے

اس جملہ کا تعلق اوپر والے جملہ 'إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ' سے ہے۔ یعنی ایک تو یہ کہ ہم اپنے اہل و عیال کے اندر ڈرتے رہے ہیں، دوسرے یہ کہ ہم خوف اور طمع، امید اور بیم ہر حال میں خدا ہی کو پکارنے والے رہے ہیں۔ اس کے سوا کسی اور کی کبھی ہم نے نہ دہائی دی اور نہ کسی کو اس کا شریک و سہیم جانا۔ اس جملہ کو اصلاً آنا تو اوپر والے جملہ ہی کے ساتھ تھا لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان کی عادت ظاہر کرنے کے لیے 'فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا ...... الآیۃ' کو اس پر مقدم کر دیا اور اس کو مؤخر کر دیا۔ اس تاخیر میں یہ بلاغت ہے کہ انسان کی نجات میں اصل عامل کی حیثیت عقیدۂ توحید کو حاصل ہے۔ جس نے اس کی حفاظت کی وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا مستحق ٹھہرا اور جس نے اس میں خرابی پیدا کی اس نے اپنی عاقبت برباد کی۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس عقیدے میں مستحکم رہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ہم پر یہ احسان فرمایا۔

'إِنَّهُ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيمُ'۔ یہ فقرہ غایت درجہ ممنونیت کے اظہار کے طور پر وہ فرمائیں گے کہ وہ بڑا ہی باوفا اور بڑا ہی مہربان ہے کہ اس نے نہ صرف وہ تمام وعدے پورے کیے جو اپنے بندوں سے کیے، بلکہ ان کو اپنے کرمِ مزید سے بھی نوازا۔ لفظ 'بَرّ' کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ جب یہ اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر آتا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اس نے اپنے بندوں سے جو وعدے کیے ہیں وہ سب کو پورا کرنے والا ہے۔ صدق اور وفا اس لفظ کی اصل روح ہے۔ اس کے ساتھ 'رحیم' کا اضافہ اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ وہ صرف وعدے ہی پورے کرنے والا نہیں، بلکہ بندوں کی کوتاہیوں سے درگزر کر کے ان کو اپنے مزید افضال سے نوازنے والا بھی ہے۔

۲۔ آگے آیات ۲۹-۴۹ کا مضمون

آگے کی آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حوصلہ افزائی فرمائی گئی ہے کہ تم ان لوگوں کی یاوہ گوئیوں کی پروا کیے بغیر اسی قرآن کے ذریعہ سے تذکیر کرتے رہو۔ جو لوگ تمہاری تکذیب پر اڑے رہیں گے وہ خود اپنی شامت بلائیں گے۔ اسی ذیل میں مخالفین کی ان باتوں کے مسکت جواب بھی دیے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں وہ کہتے تھے اور جن کی طرف اوپر لفظ 'خوض' سے اشارہ فرمایا ہے۔ ان کی اس ساری سخن سازی کو قرآن نے محض ایک چال قرار دیا ہے اور یہ اطمینان دلایا ہے کہ اس چال سے وہ دعوتِ حق کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے بلکہ یہ انہی کے خلاف پڑے گی۔ آخر میں آپ کو تسلی دی ہے کہ ان کو کوئی بڑے سے بڑا معجزہ

بھی قائل کرنے والا نہیں بنے گا، یہ اسی دن قائل ہوں گے جس دن قیامت ان کے سر پر آ کھڑی ہوگی اور ہر پہلو سے ان کی بے بسی ان پر واضح ہو جائے گی تو تم صبر کے ساتھ اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو اور اس صبر کے حصول کے لیے زیادہ سے زیادہ اپنے رب کی تسبیح کا اہتمام کرو —— اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۹-۴۹

فَذَكِّرْ فَمَآ أَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُونٍ ﴿٢٩﴾ أَمْ يَقُولُونَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُونِ ﴿٣٠﴾ قُلْ تَرَبَّصُوا فَإِنِّي مَعَكُم مِّنَ الْمُتَرَبِّصِينَ ﴿٣١﴾ أَمْ تَأْمُرُهُمْ أَحْلَامُهُم بِهٰذَآ أَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُونَ ﴿٣٢﴾ أَمْ يَقُولُونَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَل لَّا يُؤْمِنُونَ ﴿٣٣﴾ فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهٖٓ إِن كَانُوا صٰدِقِينَ ﴿٣٤﴾ أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخٰلِقُونَ ﴿٣٥﴾ أَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ ۚ بَل لَّا يُوقِنُونَ ﴿٣٦﴾ أَمْ عِندَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ أَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُونَ ﴿٣٧﴾ أَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَسْتَمِعُونَ فِيهِ ۚ فَلْيَأْتِ مُسْتَمِعُهُم بِسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ ﴿٣٨﴾ أَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُونَ ﴿٣٩﴾ أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُم مِّن مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُونَ ﴿٤٠﴾ أَمْ عِندَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُونَ ﴿٤١﴾ أَمْ يُرِيدُونَ كَيْدًا ۖ فَالَّذِينَ كَفَرُوا هُمُ الْمَكِيدُونَ ﴿٤٢﴾ أَمْ لَهُمْ إِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ ۚ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٤٣﴾ وَإِن يَرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَقُولُوا سَحَابٌ مَّرْكُومٌ ﴿٤٤﴾ فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي فِيهِ يُصْعَقُونَ ﴿٤٥﴾ يَوْمَ لَا يُغْنِي عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا وَّلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿٤٦﴾ وَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا عَذَابًا دُونَ ذٰلِكَ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٤٧﴾ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۴۸﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴿۴۹﴾ ع۲ ۴

ترجمۂ آیات ۲۹-۴۹

پس تم یاددہانی کرتے رہو، اپنے رب کے فضل سے نہ تم کوئی کاہن ہو اور نہ کوئی دیوانے۔ کیا یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک شاعر ہے جس کے لیے ہم گردش روزگار کے منتظر ہیں! ان سے کہہ دو کہ تم انتظار میں رہو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔ کیا ان کی عقلیں یہی باتیں ان کو سجھاتی ہیں یا یہ ہیں ہی سرکش لوگ! کیا یہ کہتے ہیں کہ اس کو اس نے خود ہی گھڑا ہے! بلکہ یہ ایمان نہیں لانا چاہتے۔ پس یہ اس کے مانند کوئی کلام لائیں، اگر یہ سچے ہیں۔ ۲۹ - ۳۴

کیا یہ بغیر کسی خالق ہی کے پیدا ہو گئے ہیں یا یہ خود ہی خالق ہیں! کیا انھی نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، بلکہ وہ یقین نہیں رکھتے۔ ۳۵ - ۳۶

کیا انھی کے پاس تیرے رب کے خزانے ہیں یا وہ ان پر داروغہ مقرر ہیں! کیا ان کے پاس کوئی ایسی سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر وہ آسمان کی باتیں سن لیتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ان کا سننے والا کوئی واضح دلیل پیش کرے۔ کیا اس کے لیے بیٹیاں ہیں اور تمہارے لیے بیٹے! ۳۷ - ۳۹

کیا تم ان سے کسی عوض کے طالب ہو کہ وہ اس تاوان کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں! کیا ان کے پاس علم غیب ہے۔ پس وہ خود ہی لکھ لیتے ہیں۔ کیا وہ کوئی چال چلنی چاہتے ہیں تو یاد رکھیں کہ جنھوں نے کفر کیا وہی اس چال میں گرفتار ہوں گے۔ کیا اللہ کے سوا اور کوئی معبود بھی ان کے لیے ہے؟ اللہ پاک ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک گردانتے ہیں۔ ۴۰ - ۴۳

اور اگر یہ آسمان سے کوئی ٹکڑا بھی گرتا ہوا دیکھیں گے تو کہیں گے یہ تو تہ بہ تہ بادل ہے۔ تو ان کو چھوڑ دو، یہاں تک کہ یہ اپنے اُس دن سے دو چار ہوں جس دن ان کے ہوش جاتے رہیں گے۔ جس دن نہ ان کی چال ان کے کچھ کام آئے گی اور نہ ان کی کوئی مدد ہی ہو گی۔ ۴۴-۴۶

اور ان ظالموں کے لیے اس کے سوا بھی عذاب ہے لیکن ان کی اکثریت اس کو نہیں جانتی۔ اور تم صبر کے ساتھ اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو۔ بے شک تم ہماری آنکھوں میں ہو۔ اور اپنے رب کی تسبیح کرو، اس کی حمد کے ساتھ، جس وقت تم اٹھتے ہو۔ اور شب میں بھی اس کی تسبیح کرو اور ستاروں کے پیچھے ہٹنے کے وقت بھی۔ ۴۷-۴۹

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ (۲۹)

آنحضرت کو تسلی

'ف' کے ذریعہ سے عطف دلیل ہے کہ یہ بات جو فرمائی جا رہی ہے متفرع ہے انہی باتوں پر جو اوپر گزر چکی ہیں۔ اوپر آپ نے دیکھا کہ قرآن کے انذارِ عذاب کی صداقت ثابت فرمائی گئی ہے۔ اس کے بعد یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو باندازِ تسلی خطاب کر کے ارشاد ہوا کہ تم جو یاددہانی کر رہے ہو وہ کرتے رہو۔ مخالفین کے طعنوں اور کچوکوں کی پروا نہ کرو۔ اگر یہ تمھیں کاہن یا خبطی کہتے ہیں تو انھیں بکواس کرنے دو۔ تم اپنے رب کے فضل سے نہ کوئی کاہن ہو نہ کوئی دیوانے۔

'بِنِعْمَتِ رَبِّكَ' کے الفاظ یہاں دلیل کے محل میں ہیں۔ یعنی تم پر تمھارے رب کا جو فضل و انعام ہے وہ ایسی چیز نہیں ہے کہ آنکھیں اور عقل رکھنے والوں سے وہ مخفی رہ سکے۔ تمھاری زبانِ فیض ترجمان سے اللہ تعالیٰ نے جو چشمۂ حکمت و معرفت جاری کر رکھا ہے اس کو کاہنوں کی خرافات سے کیا تعلق! تم جس کردار کے حامل ہو کس کاہن کے اندر اس کا کوئی ادنیٰ پرتو بھی پایا گیا ہے؟ تم راستبازی اور حق گوئی کے مظہر کامل ہو، اور کاہن دروغ گو اور لپاٹیے ہوتے ہیں۔ تم روح القدس سے فیض پاتے ہو اور کاہن شیاطین سے الہام حاصل کرنے کے لیے کان لگاتے ہیں اور اس میں بھی وہ بالکل جھوٹی نمائش کرتے ہیں۔

اس طرح تم کو جو دیوانہ کہتے ہیں وہ خود دیوانے ہیں۔ آخر تم سے بڑا فرزانہ، ذی ہوش، دانش مند اور حکیم انھوں نے کس کو پایا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مخالفین کا یہ اتہام ان کے اپنے ضمیر کے بالکل خلاف تھا اس وجہ سے اس کی تردید میں زیادہ دلیلیں دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی لغویت خود اتہام لگانے والوں پر واضح تھی۔ وہ محض عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے اس طرح کی باتیں کہتے تھے۔ سورۂ شعراء کی تفسیر میں ہم نے اس کے تمام ضروری پہلو واضح کر دیے ہیں۔ ایک نظر اس پر ڈال لیجیے۔

اَمْ یَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَیْبَ الْمَنُوْنِ ۝ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِیْنَ (۳۰-۳۱)

مخالفین کے ایک الزام کا جواب

یہ ان کے دوسرے الزام کا حوالہ ہے۔ فرمایا کہ کیا یہ لوگ تمھیں شاعر کہتے ہیں اور یہ توقع رکھتے ہیں کہ جس طرح دوسرے بہت سے شاعر اپنی بولیاں بول کر اڑ گئے اسی طرح گردشِ روزگار ایک دن تمھیں بھی فنا کر دے گی۔ فرمایا کہ اگر یہ لوگ اس انتظار میں ہیں تو ان سے کہہ دو کہ تم لوگ انتظار کرو، میں بھی انتظار میں ہوں کہ میں جو وعید تم کو سنا رہا ہوں وہ پوری ہوتی ہے یا تم جو خواب دیکھ رہے ہو وہ سچا ہوتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین آپ کو جو شاعر کہتے تھے تو اس کی وجہ، جیسا کہ ہم جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں، یہ نہیں تھی کہ وہ فی الواقع آپ کو کوئی شاعر سمجھتے تھے، بلکہ اس الزام سے وہ اس اثر کو مٹانا چاہتے تھے جو قرآن کے زورِ بیان اور اس کی بلاغت و جزالت سے لوگوں کے دلوں پر پڑتا تھا اور جس کے سبب سے اس کے کلامِ الٰہی ہونے کی ہیبت لوگوں پر بیٹھتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے پیروؤں کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ قرآن میں جو زور ہے یہ اسی طرح کا ہے جس طرح کا زور ہمارے بعض بڑے شاعروں کے کلام میں ہے اس وجہ سے اس کو وحی و الہام کا درجہ دے کر نہ تو کسی عذاب کے اندیشہ میں مبتلا ہونے کی ضرورت ہے اور نہ اپنے دینِ آبائی سے مایوس ہونے کی۔ جس طرح ہمارے شاعروں کے کلام کی ان کے دور میں بڑی دھوم رہی ہے، لیکن پھر نہ وہ باقی رہے اور نہ ان کی شاعری، اسی طرح چند دن اس شخص کی فصاحت و بلاغت کا تماشا بھی دیکھ لو، بالآخر اس کو بھی گردشِ روزگار مٹا کے رکھ دے گی۔

'قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِیْنَ'۔ فرمایا کہ اگر یہ لوگ اس انتظار میں ہیں تو ان کو بتا دو کہ تم لوگ بھی انتظار کرو، میں بھی انتظار کر رہا ہوں کہ تمھاری یہ طمعِ خام پوری ہوتی ہے یا میرے رب نے تم کو جس چیز سے ڈرایا ہے وہ ظاہر ہو کے رہتی ہے۔

'اَلْمَنُوْن' کے معنی 'الدھر' یعنی زمانہ کے ہیں۔ محاورہ ہے: 'دار علیھم المنون' وہ گردشِ روزگار کی نذر ہو گئے۔ 'رَیْبَ الْمَنُوْنِ' کے معنی ہیں حوادثِ روزگار۔

مخالفین کے اس الزام کی مفصل تردید قرآن نے سورۂ شعراء میں کی ہے۔ وہاں چند نہایت واضح

کسوٹیاں بھی قرآن نے لوگوں کے سامنے رکھ دی ہیں جن پر ہر عاقل پرکھ کر فیصلہ کر سکتا ہے کہ قرآن اور اس کے حامل کو شعر اور شاعری سے دور یا قریب کا کوئی واسطہ ہے یا نہیں۔ ہم نے بھی اس کے ہر پہلو پر وہاں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

اَمۡ تَاۡمُرُهُمۡ اَحۡلَامُهُمۡ بِهٰذَاۤ اَمۡ هُمۡ قَوۡمٌ طَاغُوۡنَ (۳۲)

مخالفین کی مخالفت کا اصل سبب ان کی سرکشی ہے

یعنی معاملہ دو شکلوں سے خالی نہیں یا تو فی الواقع ان کی عقلیں یہی کچھ ان کو سمجھا رہی ہیں کہ تم اللہ کے رسول نہیں بلکہ ایک کاہن، مجنون اور شاعر ہو یا یہ بات ہے کہ یہ لوگ اپنی سرکشی کے باعث تمھاری بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں اس وجہ سے تکذیب کے بہانے ڈھونڈھ رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ پہلی بات کا امکان تو بہت بعید ہے، آخر کوئی عاقل تمھارے جیسے صداقت شعار، راست باز، عاقل، فرزانہ، متین، رزین، مومن، مسلم، حنیف اور حکیم کو کاہن، مجنون اور شاعر کس طرح قرار دے سکتا ہے! اگر کوئی یہ جسارت کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ عقل سے بالکل عاری ہے۔ اب صرف دوسرا امکان باقی رہ جاتا ہے کہ یہ لوگ نہایت سرکش ہیں اور اس سرکشی ہی کے سبب سے یہ سخن سازیاں کر رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی یہ سرکشی ہی ان سے یہ باتیں کہلوا رہی ہے۔ عقل کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلۡ لَّا يُؤۡمِنُوۡنَ ۚ فَلۡيَاۡتُوۡا بِحَدِيۡثٍ مِّثۡلِهٖۤ اِنۡ كَانُوۡا صٰدِقِيۡنَ (۳۳-۳۴)

ایک اور الزام کا جواب

یہ ان کے ایک اور الزام کا حوالہ اور اس کا جواب ہے۔ فرمایا کہ کیا یہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو گھڑا تو انھوں نے خود ہے لیکن اپنی نبوت کی دھونس جمانے کے لیے دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتہ کے ذریعہ سے ان پر اتارا ہے۔ 'تَقَوَّلَ' کے معنی کسی پر جھوٹا بہتان لگانے کے ہیں۔ یہی مضمون دوسرے مقامات میں 'بَلِ افۡتَرٰىهُ' سے ادا کیا گیا ہے۔ یعنی ان کے نزدیک یہ کتاب ہے تو ان کی اپنی طبع زاد لیکن عوام فریبی کے لیے جھوٹ موٹ یہ دعویٰ کر رکھا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ نے اتاری ہے۔

'بَلۡ لَّا يُؤۡمِنُوۡنَ' یہ اصل حقیقت کا اظہار ہے کہ ان کا یہ الزام بھی ان کے اپنے ضمیر کے بالکل خلاف ہے۔ ان کو پورا یقین ہے کہ یہ کتاب تمھاری تصنیف نہیں ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اس طرح کا کلام نہ تم پیش کر سکتے ہو، نہ کوئی دوسرا پیش کر سکتا ہے لیکن یہ اس پر ایمان نہیں لانا چاہتے اس وجہ سے یہ اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ سخن سازی کر رہے ہیں۔ یہاں فعل ہمارے نزدیک ارادۂ فعل کے معنی میں ہے۔ اس کی مثالیں اس کتاب میں جگہ جگہ گزر چکی ہیں۔

'فَلۡيَاۡتُوۡا بِحَدِيۡثٍ ...... الاٰية' یہ ان کے الزام کے جواب میں ان کو چیلنج ہے کہ اگر فی الواقع وہ اس کو پیغمبر کی اپنی تصنیف گمان کرتے ہیں تو وہ اپنے خطیبوں اور شاعروں کے کلام میں سے کوئی چیز اس کے مانند پیش کریں، خواہ وہ ان کے پرانے ذخائر میں سے ہو یا اب وہ خود مر جوڑ کر بیٹھیں اور کوئی چیز

اس کے جواب میں پیش کریں۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکیں (اور ہرگز نہیں کر سکتے) تو پھر راستبازی کا تقاضا یہ ہے کہ اس الزام کو واپس لیں اور پیغمبر کو صادق و امین مان کر اس پر ایمان لائیں۔

یہ بات یہاں ملحوظ رہے کہ قرآن نے یہ بات فرمائی تھی قریش کے جواب میں، اور انہی کے جواب میں یہ فرمانے کی تھی بھی لیکن یہ چیلنج آج بھی علی حالہٖ قائم ہے۔ قرآن کے منکرین نہ تو اپنے قدیم ادبی و مذہبی ذخیرہ میں سے اس کے مانند کوئی چیز پیش کر سکے، نہ خود ہی کوئی چیز ایجاد کر سکے اور نہ بعد کی پوری تاریخ میں کوئی ایسی چیز سامنے آئی جس کو اس چیلنج کا جواب قرار دیا جا سکے۔ دنیا کی غیر عرب قوموں کے لیے یہ چیلنج براہِ راست نہیں ہے تاہم وہ بھی طبع آزمائی کر کے دیکھ سکتی ہیں کہ وہ کوئی چیز اس کے پائے کی لا سکتی ہیں یا نہیں۔ پھر یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ قرآن کی یہ تحدّی کسی ایک ہی پہلو سے نہیں بلکہ بحیثیتِ مجموعی ایک صحیفۂ ہدایت ہونے کے پہلو سے ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی قوم یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ اس کے شاعر کے پایہ کا کوئی شاعر یا اس کے خطیب کے درجے کا کوئی خطیب دنیا میں نہیں ہے لیکن اول تو یہ دعویٰ ہی محلِ نظر ہے، دوسری قوم اس کے جواب میں اپنے خطیب یا شاعر کے حق میں یہی دعویٰ کر سکتی ہے لیکن کسی کا یہ دعویٰ تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ زیادہ سے زیادہ کسی ایک ہنر میں برتری کا دعویٰ ہوگا جس کو کوئی شخص نہ اپنے نبی ہونے کے ثبوت میں پیش کر سکتا اور نہ کوئی عاقل اس بنیاد پر اس کو نبی یا رسول مان سکتا۔

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۝ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا یُوْقِنُوْنَ (۳۵-۳۶)

معترضین سے چند سوالات

مکذبین کے اعتراضات و اتہامات کے جواب دینے کے بعد اب یہ ان سے چند سوالات کیے گئے ہیں کہ اگر وہ عذاب اور آخرت کے منکر ہیں تو یہ بتائیں کہ کیا وہ بغیر خالق ہی کے پیدا ہو گئے ہیں یا خود ہی اپنے خالق ہیں؟ نیز یہ بھی بتائیں کہ کیا آسمانوں اور زمین کو انھوں نے پیدا کیا ہے؟

یہ امر واضح رہے کہ مشرکین عرب اپنا اور تمام آسمان و زمین کا خالق اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے۔ وہ اپنے مزعومہ شرکاء میں سے کسی کو کسی چیز کا خالق نہیں مانتے تھے۔ یہ سوال قرآن نے ان کے سامنے رکھ کے گویا ان سے یہ پوچھا ہے کہ جب وہ اپنا اور آسمان و زمین کا خالق اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے ہیں تو اس کے عذاب اور اس کے روزِ جزاء و سزا کو کیوں بعید از امکان سمجھتے ہیں؟ کیا ان کا گمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک مرتبہ ان کو پیدا کر کے اب دوبارہ پیدا کرنے سے عاجز ہو گیا؟ اگر وہ ایسا سمجھتے ہیں تو یہ ایک کھلی ہوئی حماقت ہے۔ جو پہلی بار پیدا کرنے پر قادر ہوا وہ دوسری بار پیدا کرنے پر بدرجۂ اولیٰ قادر ہوگا۔

اسی طرح وہ یہ بھی سوچیں کہ جب وہ خود اپنے خالق نہیں ہیں بلکہ کسی اور نے ان کو پیدا کیا اور ان کی معاش و معیشت کا سامان کیا ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ ان کو یوں ہی چھوڑے رکھے اور کسی دن ان سے یہ نہ پوچھے کہ اس نے ان کو جس مقصد کے لیے پیدا کیا تھا اس کو انھوں نے پورا کیا یا نہیں؟

علیٰ ہذا القیاس وہ یہ بھی سوچیں کہ جس زمین پر اور جس آسمان کے نیچے وہ رہتے ہیں اور جن کی گوناگوں نعمتوں سے وہ متمتع ہوتے ہیں، درآنحالیکہ نہ زمین ان کی پیدا کی ہوئی ہے نہ آسمان اور نہ ان کے درمیان کی نعمتیں، تو کیا جس نے ان کو پیدا کیا ہے اس کا کوئی حق ان پر قائم نہیں ہوتا اور اس کے بنائے ہوئے اس گھر میں اپنے رویے سے متعلق وہ اس کے آگے جوابدہ نہیں ہوں گے؟

اسی طرح وہ یہ بھی سوچیں کہ جب نہ زمین ان کی پیدا کی ہوئی ہے نہ آسمان تو آخر کس برتے پر آسمان و زمین کے خالق سے اپنے کو وہ بے خوف و مامون سمجھتے ہیں۔ وہ جب چاہے زمین کو ذرا سا ہلا دے اور یہ بالکل بے نام و نشان ہو کے رہ جائیں، اس طرح جب چاہے آسمان سے طوفان بھیج دے، اُولے برسا دے، پتھراؤ کر دے اور چشم زدن میں اُن کو صفحۂ ہستی سے مٹا دے۔

اصل علّتِ انکار

'بَلْ لَّا یُوْقِنُوْنَ' یہ ان کے اعراض و انکار کی اصل علّت سے پردہ اٹھایا ہے کہ یہ ان تمام اصولی باتوں کو تو مانتے ہیں جو آخرت اور جزا و سزا کو لازم ٹھہراتی ہیں، ان میں سے کسی بات کے انکار کی وہ جرأت نہیں کر سکتے لیکن اس بات پر وہ یقین نہیں رکھتے کہ فی الواقع وہ عذاب کے مستحق ہیں اور اگر انھوں نے اپنی روش نہ بدلی تو ایک دن وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کی گرفت میں آ جائیں گے۔ یہاں 'یُوْقِنُوْنَ' کا مفعول 'بالاخرۃ' یا 'بالعذاب' بربنائے قرینہ محذوف ہے۔

ہم یہ حقیقت جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں کہ مشرکینِ قریش قیامت کے صریح منکر نہیں تھے اس کو وہ ایک نہایت مستبعد چیز سمجھتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ قیامت اور عذاب و ثواب کا قصہ اوّل تو محض ایک وہم ہے؛ ثانیاً اس کی کچھ حقیقت ہے بھی تو یہ اتنی دُور کی چیز ہے کہ اس کے لیے ابھی سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے؛ ثالثاً اس کا مرحلہ بالفرض آیا بھی تو ہمارا معاملہ ہمارے دیوتاؤں سے متعلق ہوگا، وہ اپنی سفارش سے ہمیں اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچا ہی لیں گے۔ اسی طرح وہ اس عذاب پر بھی یقین نہیں رکھتے تھے جس سے قرآن ان کو بصورتِ تکذیب اس دنیا میں آگاہ کر رہا تھا۔ وہ اپنی موجودہ خوشحالی کو اپنے عقیدہ و عمل کی صحت کی دلیل بنائے بیٹھے تھے۔ ان کا گمان یہ تھا کہ اگر فی الواقع وہ خدا کے غضب کے سزاوار ہوتے، جیسا کہ پیغمبرؐ اور ان کے ساتھی کہتے ہیں، تو ان کا حال دنیوی رفاہیت کے اعتبار سے پیغمبرؐ اور ان کے ساتھیوں سے بہتر کیوں ہوتا؟ پھر تو صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہوتی تھی۔

ان کی اس ذہنی حالت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اصلاً یہ عدم یقین ہی کی صورت ہے۔ اصل حقیقت سے تو ان کے لیے فرار کی کوئی گنجائش تھی نہیں۔ اس کے تمام مقدمات ثابت اور معلوم تھے۔ انفس، آفاق، تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کے تمام شواہد اس کے حق میں موجود تھے اور قرآن نے وہ سب ان کے سامنے رکھ بھی دیے تھے لیکن چونکہ اس کو تسلیم کرنا ان کی خواہش کے خلاف تھا اس وجہ سے وہ جان کر انجان بنتے تھے۔ یہ یقین نہیں رکھتے تھے کہ فی الواقع یہ چیز ایک دن پیش آ کے رہے گی۔

مزید غور کیجیے تو یہ حقیقت بھی آپ کے سامنے آئے گی کہ عدمِ یقین کی اس بیماری میں جس طرح قریش مبتلا تھے اسی طرح اس زمانے کے بہت سے مسلمان بھی مبتلا ہیں۔ ان کو قیامت اور جزاء و سزا سے انکار تو نہیں ہے لیکن ان کی زندگی شاہد ہے کہ ان کو اس کا یقین نہیں ہے اور ان کے اس عدم یقین کے اسباب کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہ بھی اسی طرح کی کسی نہ کسی غلط فہمی کے شکار ہیں جس طرح کی غلط فہمیوں میں مشرکین مبتلا تھے۔

اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَۜيْطِرُوْنَ (۳۷)

ایک اور سوال

جس طرح کے سوال اوپر کی دو آیتوں میں کیے ہیں اسی طرح کا سوال یہ بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ اپنے یا آسمان و زمین کے خالق نہیں تو کیا تیرے رب کے خزانوں کے مالک یا ان پر داروغہ ہیں کہ وہ خدا کی پکڑ سے بے فکر ہیں! یعنی جس طرح وہ آسمان و زمین کے خالق ہونے کے مدعی نہیں ہو سکتے اسی طرح اس بات کے بھی مدعی نہیں ہو سکتے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رزق و فضل کے خزانے ان کے حوالے کر دیے ہیں یا ان کی تقسیم پر ان کو مامور کر دیا ہے کہ جس کو چاہیں دیں، جس کو چاہیں نہ دیں۔ پھر ان کو یہ غرہ کیوں ہے کہ وہ خدا کی پکڑ میں نہیں آ سکتے یا جس عیش میں وہ ہیں اسی میں رہیں گے، نہ اس دنیا میں وہ اس سے محروم ہو سکتے اور نہ آخرت میں (اگر وہ ہوئی) اس سے ان کو کوئی محروم کر سکتا؟ قرآن نے جگہ جگہ قریش اور ان سے پہلے کی قوموں کے مترفین کے اس زعم کا حوالہ دیا ہے کہ انھوں نے اپنی رفاہیت کو اپنا پیدائشی حق سمجھا اس وجہ سے پیغمبر کے انذار کو خاطر میں نہ لائے۔ یہ ان کے اسی خنّاس پر ضرب لگائی ہے کہ جب نہ وہ خدا کے خزانوں کے مالک نہ ان کی تقسیم پر مامور تو اس خبط میں مبتلا ہونے کی کیا وجہ ہے؟ اللہ تعالیٰ جب چاہے چشم زدن میں ان کے سارے عیش کو خاک میں ملا دے سکتا ہے اور اپنی نعمتوں سے ان کو بہرہ مند کر سکتا ہے جن کو یہ کسی نعمت کا حق دار نہیں سمجھتے۔

قرآن نے یہی بات، معمولی تغیرِ الفاظ کے ساتھ، قریش کے ان مغروروں کو بھی خطاب کر کے فرمائی ہے جو کہتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی بشر ہی کو رسول بنا کر بھیجنے والا ہوتا تو مکہ یا طائف کے کسی رئیس کو رسول بناتا، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسے غریب و نادار کو کیوں رسول بناتا؟ اسی طرح اگر یہ دین، جس کی یہ دعوت دے رہے ہیں، کوئی خدائی دین ہوتا تو اس کے حامل بننے کے لیے اللہ تعالیٰ ہم کو چنتا نہ کہ اس کے حامل وہ نادار قلاش اور غلام بنتے جن کو اس دنیا کی کوئی نعمت و عزت بھی حاصل نہیں ہوئی ——— اس آیت میں ان مغروروں کے غرور پر بھی ایک کاری ضرب لگائی گئی ہے۔

اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ ۚ فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (۳۸)

کفار کے بے بنیاد اوہام

یعنی اگر ان کا زعم یہ ہے کہ وہ اسی طرح دنیا میں بھی عیش کریں گے اور آخرت ہوئی تو وہاں بھی سب پر بالا رہیں گے تو اس زعم کی بنیاد کیا ہے؟ کیا ان کے پاس کوئی ایسی سیڑھی ہے جس کو آسمان میں لگا کر اپنے حق میں اللہ کے فیصلے سن لیا کرتے ہیں؟ کیا ان پر کوئی کتاب نازل ہوئی ہے جس میں ان کی پسند کی سب باتیں

لکھی ہوئی ہیں؟ کیا اللہ تعالیٰ نے ان کو کوئی براءت نامہ لکھ کر پکڑا دیا ہے کہ تم جو چاہے اودھم مچاتے پھرو، ہم نہ دنیا میں تم کو کچھ کہیں گے نہ آخرت میں تم سے کوئی باز پرس ہونی ہے، اگر اس طرح کی کوئی خبر ان کے کسی آسمانی مخبر نے ان کو پہنچائی ہے تو وہ اس کے حق میں کوئی واضح دلیل پیش کریں۔

یہاں یہ بات اجمال کے ساتھ فرمائی گئی ہے۔ سورۂ قلم میں یہ پوری وضاحت کے ساتھ آئی ہے۔ ہم نے آیت کی تفسیر سورۂ قلم کی روشنی ہی میں کی ہے اس وجہ سے متعلق آیات نقل کیے دیتے ہیں تاکہ کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ہم نے تاویل میں تکلف سے کام لیا ہے۔ وہاں فرمایا ہے:

أَمْ لَكُمْ كِتَٰبٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ ۝	کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں وہی باتیں
إِنَّ لَكُمْ فِيهِ لَمَا تَخَيَّرُونَ ۝ أَمْ	مرقوم ہیں جو تم چاہتے ہو! کیا ہم نے تم سے قیامت
لَكُمْ أَيْمَٰنٌ عَلَيْنَا بَٰلِغَةٌ إِلَىٰ يَوْمِ ٱلْقِيَٰمَةِ	تک کے لیے کچھ عہد کر رکھے ہیں کہ تم جو کہو گے وہی
إِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُونَ ۝ سَلْهُمْ أَيُّهُم	تمھیں ملے گا! ان سے پوچھو کہ کون ان چیزوں کا
بِذَٰلِكَ زَعِيمٌ (القلم: ۶۸-۴۰)	ضامن بنتا ہے!

زیر بحث آیت میں زبان کے معروف قاعدے کے مطابق کچھ محذوفات ہیں ان کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی: (ام لھم سلم منصوب الی السماء فیسمعون صاعدین فیه ...) جس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ انسان اپنی رہنمائی کے لیے آسمانی وحی کا محتاج ہے۔ اب یا تو ہر شخص اس بات کا ثبوت بہم پہنچائے کہ اس کے پاس آسمانی ہدایت معلوم کرنے کے ذرائع و وسائل موجود ہیں اور اگر ہر شخص اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور ظاہر ہے کہ نہیں کر سکتا تو اس پر واجب ہے کہ وہ ان لوگوں کی رہنمائی پر بھروسہ کرے جو ان وسائل سے بہرہ مند ہیں۔

أَمْ لَهُ ٱلْبَنَٰتُ وَلَكُمُ ٱلْبَنُونَ (۳۹)

شرکاء و شفعاء کا غرّہ بالکل باطل ہے

یعنی مذکورہ باتوں میں سے اگر کوئی بات نہیں ہے تو کیا تمھارا غرّہ اپنے شرکاء و شفعاء کے بل پر ہے کہ وہ دنیا میں بھی تمھارے محافظ ہیں اور آخرت میں بھی وہ شفیع و مددگار رہیں گے۔ اگر یہ بات ہے تو اس زعم کا بھونڈا پن واضح کر دینے کے لیے تنہا یہی بات کافی ہے کہ تم نے خدا کے لیے تو لڑکیاں فرض کر رکھی ہیں، درآنحالیکہ اپنے لیے لڑکوں کو پسند کرتے ہو، لڑکیوں سے نفرت کرتے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اس سوال پر غور کرنے کی توفیق نہیں ہوئی تھی کہ خدا کا کوئی شریک و کفو ہو سکتا ہے یا نہیں تو کم از کم یہ احساس تو انسانی فطرت کا بالکل بدیہی تقاضا تھا کہ خدا کے لیے اس چیز کو پسند نہ کرتے جسے اپنے لیے پسند نہیں کرتے لیکن تم نے دہری حماقت کی۔ ایک تو بے دلیل خدا کے شریک ٹھہرائے، پھر شریک بھی بنایا تو ایسی چیز وں کو جن کو اپنا شریک بنانا تمھیں گوارا نہیں ہے۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ مشرکین عرب کے ہاں سب سے اونچا درجہ تین دیویوں کا تھا جن کے متعلق ان کا

گمان تھا کہ یہ خدا کی چہیتی بیٹیاں ہیں اور اپنے باپ سے جو چاہیں منوا سکتی ہیں۔ ان کا ذکر تفصیل سے آگے والی سورہ میں یوں آیا ہے۔

اَفَرَءَیۡتُمُ اللّٰتَ وَ الۡعُزّٰی ۙ وَ مَنٰوۃَ	ذرا غور تو کرو لات اور عزّیٰ اور منات پر جو تین
الثَّالِثَۃَ الۡاُخۡرٰی ۝ اَلَکُمُ الذَّکَرُ وَ لَہُ	کی تیسری اور درجے میں دوسری ہے۔ کیا تمھارے
الۡاُنۡثٰی ۝ تِلۡکَ اِذًا قِسۡمَۃٌ ضِیۡزٰی ۝ اِنۡ	لیے بیٹے ہیں اور اس کے لیے بیٹیاں ہیں! پھر تو یہ
ہِیَ اِلَّاۤ اَسۡمَآءٌ سَمَّیۡتُمُوۡہَاۤ اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُکُمۡ	بڑی ہی بھونڈی تقسیم ہوئی! یہ محض نام ہیں جو تم نے اور
مَّاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ بِہَا مِنۡ سُلۡطٰنٍ ؕ	تمھارے باپ دادا نے رکھ چھوڑے ہیں۔ اللہ نے ان
(النجم : ۱۹-۲۳)	کے حق میں کوئی دلیل نہیں اتاری۔

اَمۡ تَسۡـَٔلُہُمۡ اَجۡرًا فَہُمۡ مِّنۡ مَّغۡرَمٍ مُّثۡقَلُوۡنَ (۴۰)

مخالفین کی حق بیزاری پر تعجب

یہ ان لوگوں کی حق بیزاری پر اظہار تعجب ہے کہ آخر یہ تمھاری بات سنتے کیوں نہیں؟ اپنی بات سنانے پر تم ان سے کسی تنخواہ یا معاوضہ کے طالب تو ہو نہیں کہ اس کے بوجھ تلے یہ دبے جا رہے ہوں! تم تو اپنے رب کی نعمت مفت بانٹ رہے ہو تو ان کو کیا حرج ہوتا ہے کہ وہ اس کے سننے کے بھی روادار نہیں۔

یہ امر واضح رہے کہ جہل کے مقابل میں علم بہرحال ایک محبوب و مطلوب شے ہے۔ کوئی سلیم الفطرت نہ یہ گوارا کرتا اور نہ اسے گوارا کرنا چاہیے کہ اس کے سامنے اس چیز کا علم پیش کیا جائے جس سے وہ بے خبر ہے اور وہ اس کے سننے کا بھی روادار نہ ہو۔ ایسے شخص کی مثال اس اندھے کی ہے جو ٹھوکریں کھا رہا ہے لیکن کوئی اس کو رستہ پر لانا چاہتا ہے تو اس کے ہاتھ وہ جھٹک دیتا ہے۔ اہل عرب امّی، یعنی دین و شریعت سے بے خبر تھے۔ ان کی اس بے خبری کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اللہ کی ہدایت معلوم کرنے کے طالب بنتے بالخصوص جب کہ ان کے ہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے زمانے سے یہ روایت بھی چلی آ رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کے اندر سے ایک رسول اٹھائے گا جو لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لائے گا اور جس سے دنیا کی تمام قومیں ہدایت پائیں گی۔ ان پر واجب تھا کہ جب انہی کے اندر کے ایک بہترین شخص نے ان کو اللہ کے راستہ کی دعوت دی تو وہ اس کی بات سنتے اور سنجیدگی سے اس پر غور کرتے لیکن توقع کے خلاف انھوں نے اس کے بالکل خلاف روش اختیار کی۔ ان کی اسی حالت پر قرآن نے اس آیت میں تعجب کا اظہار فرمایا ہے۔

اَمۡ عِنۡدَہُمُ الۡغَیۡبُ فَہُمۡ یَکۡتُبُوۡنَ (۴۱)

یعنی تم سے اور تمھاری پیش کردہ ہدایت سے یہ اس قدر بیزار ہیں تو کیا ان کے پاس غیب کے خود جان لینے کا کوئی ذریعہ موجود ہے جس سے وہ تمام ضروری باتیں معلوم کر کے لکھ لیتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس طرح کا کوئی ذریعہ ان کے پاس موجود نہیں ہے۔ ایسی حالت میں حق تو یہ تھا کہ وہ تمھاری پکار پر لپکتے کہ تم اللہ تعالیٰ کی وحی کے ذریعہ سے ان کو اس کے احکام اور اس کی مرضیات سے آگاہ کرنے کے لیے اٹھے ہو۔ لیکن وہ تم سے تو بیزار ہیں البتہ

خود اپنے جی سے انھوں نے شریعت گھڑ رکھی ہے جو ہے تو ان کی من مانی خواہشات اور ان کے اوہام کا مجموعہ لیکن اس کو انھوں نے اللہ کا اتارا ہوا دین سمجھ رکھا ہے۔ ان کی اسی طرح کی خواہشات و بدعات کی طرف سورۂ نجم آیت ۳۵ میں یوں اشارہ فرمایا ہے: اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَیْبِ فَهُوَ یَرٰی (کیا اس کے پاس علم غیب ہے پس وہ دیکھ رہا ہے) اس آیت میں اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جو باعتبار ایمان و عمل تو بالکل صفر تھے لیکن ان کا زعم یہ تھا کہ وہ بزرگوں کی اولاد ہیں اس وجہ سے ان کو اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑے بڑے درجے ملیں گے۔ اپنے اس پندار کے سبب سے وہ پیغمبرؐ کے انذار کا مذاق اڑاتے اور کہتے کہ ہمیں عذاب سے ڈراتے ہیں حالانکہ بہت جلد گردشِ روزگار خود انھیں ختم کر دینے والی ہے اور ہم اس کے منتظر ہی ہیں۔

اَمْ یُرِیْدُوْنَ كَیْدًا ؕ فَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِیْدُوْنَ (۴۲)

اصل حقیقت کی پردہ کشائی

یہ سوال ہی کے پیرایہ میں اصل حقیقت سے پردہ اٹھا دیا ہے کہ یہ ساری دلیل بازیاں اور سخن سازیاں تو محض ظاہر کا پردہ ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ پیغمبرؐ کی دعوت کے فروغ میں ان کو اپنی سیادت کا خاتمہ نظر آتا ہے۔ اس کو بچانے کے لیے یہ ساری باتیں وہ، اپنے ضمیر کے بالکل خلاف، گھڑتے اور پھیلاتے ہیں تاکہ ان کے عوام اس دعوت سے متاثر ہو کر ان کے ہاتھوں سے نکل نہ جائیں۔ فرمایا کہ کیا یہ کوئی چال چلنی چاہتے ہیں! اگر یہ بات ہے تو یاد رکھیں کہ جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ خود اپنے دام میں گرفتار ہیں۔

حق کے خلاف سازش کرنے والے خود اپنے دام میں گرفتار ہوتے ہیں

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ حق سے برگشتہ رہنے اور لوگوں کو اس سے برگشتہ کرنے کے لیے اپنے ضمیر کے بالکل خلاف اس طرح کی چالیں چلتے ہیں وہ حق کی دعوت دینے والوں کا کچھ بھی نہیں بگاڑتے بلکہ خود اپنے ہی کو تباہی کے کھڈ میں گراتے ہیں۔ نجات و فلاح کا راستہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے بتایا ہے۔ کوئی شخص اس سے ہٹ کر دوسری راہ اختیار کرتا ہے تو وہ اپنی ضلالت کو ہدایت ثابت کرنے کے لیے صحیح راہ بتانے والوں پر خواہ کتنی ہی تہمتیں تراشے اور کج روی کی حمایت میں کتنی ہی دلیلیں گھڑے لیکن جب انجام اس کے سامنے آئے گا تب اس پر واضح ہو جائے گا کہ وہ خود اپنے ہی دام میں اسیر ہو کر اس منزل تک پہنچا ہے۔

اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَیْرُ اللّٰهِ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ (۴۳)

خدا کے ساتھ شرک کا کوئی جوڑ نہیں

یعنی بالآخر تو سب کو اللہ ہی کے آگے حاضر ہونا اور اسی کے حضور جواب دہی کرنی ہے تو جو چالیں اس کے خلاف چلیں گے ان کے انجام سے ان کو کون بچائے گا! کیا ان کا گمان یہ ہے کہ اللہ کے سوا ان کے کچھ اور معبود بھی ہیں جو ان کی مدد کریں گے تو یاد رکھیں کہ اللہ جلّ شانہٗ ان چیزوں سے پاک اور ارفع ہے جن کو وہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

'سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ' میں دلیل کا جو پہلو ہے اس کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی ایسی صفت منسوب نہیں کی جا سکتی جو اس کی مسلم صفات کے منافی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات خود بیان فرما دی ہیں جن کو مشرکین عرب بھی مانتے تھے لیکن ساتھ ہی انھوں نے اپنی خواہشوں اور بدعات کو دین بنانے کے لیے اس کے ساتھ شرک کا جوڑ بھی لگا رکھا تھا حالانکہ اس جوڑ سے خدا کی تمام بنیادی صفات کی نفی ہو جاتی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف ان الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جلّ شانہٗ ان کی ان مشرکانہ نسبتوں سے بالکل پاک ہے۔

ان خرافات کا اس کی عظیم اور رفیع الشان ذات سے کوئی جوڑ نہیں ہے۔

وَاِنۡ یَّرَوۡا کِسۡفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا یَّقُوۡلُوۡا سَحَابٌ مَّرۡکُوۡمٌ (۴۴)

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ جب ان کی ساری سخن سازیاں محض چال اور فریب کی نوعیت کی ہیں تو ان کو مطمئن کرنا تمہارے بس میں نہیں ہے۔ ان کو دلیلوں سے قائل کرنا تو درکنار اگر یہ اس عذاب کو بھی آسمان سے نازل ہوتا دیکھ لیں جس سے تم ان کو آگاہ کر رہے ہو تو اس کو بھی یہ تہ بہ تہ بادل کہیں گے اور اپنے کو مطمئن کر لیں گے کہ یہ ابرِ کرم بن کر ان کے کھیتوں اور باغوں کو سیراب کرنے والا ہے۔

چال چلنے والوں کو قائل کرنا کسی کے بس میں نہیں

اس فقرے میں ثمود کے تاریخی واقعہ کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ ان کو جس عذاب سے ڈرایا گیا تھا جب وہ ان کے سروں پر آ دھمکا تب بھی انھوں نے اس کا یقین نہیں کیا بلکہ یہ کہہ کر اپنے کو مطمئن کر لیا کہ ھٰذَا عَارِضٌ مُّمۡطِرُنَا (الاحقاف: ۲۴) (یہ تو ہمیں سیراب کرنے والا بادل ہے)۔ مطلب یہ ہے کہ اسی طرح یہ لوگ عذاب کو دیکھ کر بھی ماننے والے نہیں ہیں۔ یہ اسی وقت مانیں گے جب عذاب ان کو پامال کر دے گا، لیکن اس وقت ماننا اور نہ ماننا دونوں یکساں ہوگا۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ کسی کو قائل کرنے کی توقع اسی حد تک کی جا سکتی ہے جب تک گمان ہو کہ اس کے ذہن میں فی الواقع کچھ شبہات و اعتراضات ہیں جو اس کے لیے قبولِ حق میں حجاب بنے ہوئے ہیں۔ اس وقت تک ایک داعی کا فرض ہے کہ اس کے شبہات دور اور اس کے اعتراضات رفع کرنے کی کوشش کرے لیکن جب یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آ جائے کہ اس کی ساری دلیل بازی محض ایک چال (کید) اور مکر ہے جس کے پردے میں چھپ کر وہ حقیقت سے فرار اختیار کرنا چاہتا ہے تو پھر اس پر وقت ضائع کرنا بالکل بے سود ہے۔ پھر اس کا معاملہ اللہ ہی کے حوالے کرنا چاہیے۔

فَذَرۡهُمۡ حَتّٰی یُلٰقُوۡا یَوۡمَهُمُ الَّذِیۡ فِیۡهِ یُصۡعَقُوۡنَ ۙ یَوۡمَ لَا یُغۡنِیۡ عَنۡهُمۡ کَیۡدُهُمۡ شَیۡـًٔا وَّلَا هُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ (۴۵-۴۶)

مطلب یہ ہے کہ جب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ یہ لوگ چال چل رہے ہیں تو اب ان کے درپے ہونے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اب ان کو اس دن کے حوالے کرو جس دن صورِ اسرافیل سے ان پر غشی طاری ہو جائے گی۔ یہ اشارہ اس دن کی طرف ہے جس کے ہول کی تصویر سورۂ حج میں بدیں الفاظ کھینچی گئی ہے: وَتَرَی النَّاسَ سُکٰرٰی وَمَا هُمۡ بِسُکٰرٰی وَلٰکِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِیۡدٌ (۲) (اور تم لوگوں کو مدہوش دیکھو گے اور یہ مدہوشی شراب کی نہیں ہوگی بلکہ اللہ کا عذاب ہی بڑا سخت ہوگا)۔

یَوۡمَ لَا یُغۡنِیۡ عَنۡهُمۡ کَیۡدُهُمۡ ...... الاٰیۃ۔ فرمایا کہ اس دن نہ ان کی یہ چالیں کچھ کام آئیں گی، نہ ان کے اعوان و انصار ان کی کچھ مدد کر سکیں گے اور نہ ان کے مزعومہ شرکاء و شفعاء ہی سے ان کو کچھ سہارا حاصل ہو سکے گا بلکہ ہر ایک کو سابقہ صرف اللہ رب العزت سے پیش آئے گا اور وہ سب کا کیا دھرا ان کے سامنے رکھ دے گا۔

وَاِنَّ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِکَ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (۴۷)

اس عذاب کی طرف اشارہ جو مکذبین رسول پر دنیا میں آتا ہے

یعنی آخرت کا عذاب تو ہے ہی، ان ظالموں کے لیے ایک عذاب اس سے پہلے بھی ہے لیکن ان کی اکثریت اس سے بے خبر ہے۔ یہ اشارہ اسی عذاب کی طرف ہے جو سنتِ الٰہی کے مطابق ان لوگوں پر ہمیشہ آیا ہے جنھوں نے اپنے رسول کی تکذیب کی اور اس پر اڑے رہ گئے۔ اس سنتِ الٰہی کی وضاحت ہم جگہ جگہ کرتے آ رہے ہیں۔ یہ عذاب قریش کے مکذبین پر بھی آیا اور وہ سب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ ہی میں ذلیل و پامال ہو گئے۔

وَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ فَاِنَّکَ بِاَعْیُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ حِیْنَ تَقُوْمُ ۝ وَمِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ (۴۸-۴۹)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر اور انتظار کی ہدایت

یہ نہایت دلنواز پیرایہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و انتظار کی ہدایت اور ساتھ ہی اس صبر کے حصول کی تدبیر تلقین فرمائی گئی ہے۔

'وَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ'۔ 'صبر' کے بعد 'لِ' کا صلہ اس بات کا قرینہ ہے کہ لفظ 'صبر' یہاں انتظار کے مفہوم پر متضمن ہے۔ یعنی پوری استقامت کے ساتھ اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو۔ 'حکم' سے مراد ان باتوں کے ظہور کا حکم ہے جو اوپر مذکور ہوئیں۔

'فَاِنَّکَ بِاَعْیُنِنَا'۔ یہ نہایت ہی دل نواز فقرہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم ہر وقت ہماری آنکھوں یعنی ہماری حفاظت میں ہو۔ یہ کتنی ہی چالیں چلیں لیکن مجال ہے جو تمھیں کوئی گزند پہنچا سکیں۔

حصولِ صبر کی تدبیر

'وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ حِیْنَ تَقُوْمُ' یہ اس صبر کے حصول کی تدبیر ارشاد ہوئی ہے کہ اس کے لیے زیادہ سے زیادہ نماز بالخصوص تہجد کی نماز کا اہتمام کرو۔ 'حِیْنَ تَقُوْمُ' کی تفسیر وضاحت سے ہم سورۂ شعراء کی آیات ۲۱۷-۲۱۸: 'وَتَوَکَّلْ عَلَی الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ ۝ الَّذِیْ یَرٰىکَ حِیْنَ تَقُوْمُ' (اور خدائے عزیز و رحیم پر بھروسہ رکھو جو تمھیں دیکھتا ہے جب تم اٹھتے ہو) کے تحت کر چکے ہیں۔ اسی طرح 'تسبیح' کے ساتھ 'حمد' کی قید کی وضاحت بھی اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

'وَمِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ' یہ ٹکڑا معمولی تغیرِ الفاظ کے ساتھ سورۂ قٓ آیات ۳۹-۴۰ میں بھی گزر چکا ہے۔ اس کی تفسیر وہاں دیکھ لیجیے۔ یہاں ساری بحث دہرانے میں طوالت ہوگی۔ قٓ کی آیات ہم نقل کیے دیتے ہیں: 'فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ۝ وَمِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ۝'

بفضلِ ایزدی ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علٰی ذٰلک۔

رحمان آباد

۱۵- مئی ۱۹۷۷ء

۱۶- جمادی الاول ۱۳۹۷ھ